59

محدث

وداعیا الی اللہ باذنہ وسراجا منیرا

6/9

مجلس التحقیق الاسلامی گارڈن ٹاؤن لاہور

مدیر اعلیٰ
حافظ عبدالرحمن مدنی

ماہنامہ محدث لاہور

ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارُف

مُدیر اعلیٰ: حافظ عبدالرحمٰن مدنی   مُدیر: ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے - جس کا نام محدث تھا- کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیمِ ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین ودانشور حافظ عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ نے اس کا اِجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ ۱۹۷۰ء سے اب تک کامیابی وکامرانی سے شائع ہورہا ہے، وللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحبِ علم وفضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور ملحدانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گھر بیٹھے 'محدث' وصول کیجئے!

قارئین کرام! گھر بیٹھے محدث حاصل کرنے کیلئے درج ذیل طریقہ کار اختیار کریں!

فی شمارہ: ۲۰روپے   زرِ سالانہ: ۲۰۰روپے بیرون ملک: ۲۰ڈالر

بذریعہ منی آرڈر ربینک ڈرافٹ ۲۰۰روپے بھیج کر سال بھر گھر بیٹھے محدث وصول کریں اور علمی وتحقیقی مضامین سے استفادہ کریں۔   ایڈریس: ماہنامہ محدث، ۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰

فون نمبر: 042 - 3586639 / 35866476   موبائل: 0305 - 4600861

انٹرنیٹ پر محدث پڑھنے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کیلئے درج ذیل ویب سائٹ دیکھئے!

www.kitabosunnat.com __   www.mohaddis.com

مزید تفصیلات کیلئے: webmaster@kitabosunnat.com

اجرائے مُحدث کے مقاصد

☜ عناد اور تعصّب قوم کیلئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں!

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

☜ علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

☜ غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے!

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

☜ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالح دینیہ کے خلاف ہے!

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین و مسائل اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

☜ آئین و سیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے!

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تورہ جاتی ہے چنگیزی۔

☜ جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے!

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمایئے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!

کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

ملّتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلّہ

ماہنامہ **مُحدّث** لاہور

(فون) صدر دفتر: ۳۵۴۲۵۰ | ذیلی دفتر: ۵۴۸۷۳

جلد ۶ | رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ | عدد ۹

فہرست مضامین

۱۔ فکر و نظر ...... ماہِ رمضان ماہِ تطہیر ہے .... ادادیہ ۲

۲۔ الکتاب الحکیم ..... زمین کتنی کیوں نہ ہو جائز ہے ..... مولانا عزیز زبیدی ۱۰

۳۔ السنۃ والحدیث ... کمائی جائز ہو تو وہ جائز ہے خواہ کتنی ہو... 〃 ۱۲

۴۔ دارالافتاء ...... تراویح ۔نعمت البدعۃ ہذہ ..... 〃 ۲۳

۵۔ خار بھی تیری راہ کے پھول ہیں تیری راہ میں .... (نظم) مولانا عبدالرحمٰن عاجز ۲۷

۶۔ عربی زبان و ادب پر قرآن کریم کے اثرات .... پروفیسر غلام احمد صاحب حریری ۲۸

۷۔ سیدہ ام کلثوم بنت محمدؐ .... پروفیسر محمد سلیمان اظہر ۴۰

ناشر: حافظ عبدالرحمٰن مدنی طابع: چودھری رشید احمد مطبع: مکتبہ جدید پریس، ۴۔ شارع فاطمہ جناح، لاہور

زرِ سالانہ: ۱۵/۰۰ روپے فی پرچہ ۱/۵۰ روپیہ

فکر و نظر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ماہِ رمضان ماہِ تطہیر ہے

دنیا آخرت کی کھیتی ہے :

الدنیا مزرعۃ الاخرۃ (رمنادی -)

اس کی روایتی حیثیت جو کچھ ہو تاہم یہ ایک واقعہ ہے کہ: یہ دنیا کارگاہِ عمل ہے، جو کچھ آج یہاں بوئے گا کل وہی جا کر کاٹے گا۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (پ ۲۸ - حشر)

قرآن حکیم نازل ہوا کہ انسان اندھیرے میں نہ رہے اور اس کا جو بھی قدم اٹھے بے ہوشی میں نہ اٹھے، اور کل جب آنکھیں کھلیں گی، تو وہ بے خبری کا بہانہ نہ بنا سکے۔

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ
بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْبِ
اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝
اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ بَلٰى
قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

(پ ۲۴ - زمر ع ۶)

اور تمہارے رب کی طرف سے (نصیحت کی) جو اچھی اچھی باتیں تم پر نازل ہوتی ہیں، ان کی پیروی کرو۔ اس سے پہلے کہ تم پر یکایک عذاب آ نازل ہو اور تم کو (اس کے آنے کی) خبر (بھی) نہ ہو (کہیں ایسا نہ ہو کہ کل) کوئی کہنے لگے کہ اے افسوس! میری اس کوتاہی پر جو میں نے پاسِ خدا (ملحوظ رکھنے) میں کی اور میں تو ہنستا ہی رہا۔ یا کہنے لگے کہ اگر خدا مجھ کو (نیک) ہدایت دیتا تو میں (بھی) متقیوں میں سے ہوتا۔ یا جب عذاب کو دیکھ کر لگے کہنے کہ اے کاش! مجھے (دنیا میں پھر لوٹ جانا نصیب) ہو تو میں (بھی) نیکوں میں سے بنوں (اس وقت خدا ان سے فرمائے گا کہ ہاں) ہاں ہمارے احکام تجھ کو پہنچے اور تو نے اُن کو جھٹلایا اور اکڑ بیٹھا اور منکروں میں سے

(ایک منکر تو بھی) تھا۔

بہشت احکم الحاکمین کا ایک مقامِ قرب اور بندگانِ خدا کے لیے جائے نزول اور مقامِ طمانیت ہے۔ لیکن اس کی یہ خصوصیت ہے کہ:

اس کا ہر گوشہ بلکہ اس کا ہر ذرہ بازاری پن، غیر شائستہ حرکت، معصیتوں کی آلائش باطل اور جھوٹ کی ساری ممکن قدروں سے پاک اور منزہ ہے تو کجا وہاں اس کی بھنک بھی کانوں میں نہیں پڑے گی۔

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا (پ ۲۷ - الواقعۃ ع)

وہاں نہ تو کوئی لغو بات سنیں گے اور نہ کوئی غیر شائستہ حرکت (دیکھیں گے)

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا (پ ۳۰ - نبا ع)

وہاں وہ لوگ نہ تو کوئی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ کوئی جھوٹ۔

معصیت، بازاری پن اور باطل کے چرکے تو دور کی بات ہے۔ اس کی نزاکتیں اور لطافتیں تو ایسی کسی لغزش کے صدور کی بھی متحمل نہیں ہیں جو بشری کمزوری کے نتیجے میں "بھولے" سے انسان سے سرزد ہو سکتی ہے، جیسا کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حادثہ میں آپ نے پڑھا ہے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (پ ۱۶ - طٰہٰ ع)

ہم نے اس سے پہلے آدم سے ایک عہد لیا تھا تو وہ اسے بھول گئے اور ہم نے اس سلسلے میں اس کا پختہ عزم نہیں پایا تھا۔

ایسی پاک، اور معصوم جگہ صرف انہی خوش نصیبوں کے لیے ہو سکتی ہے جن کی زندگیاں پاک اور صاف ستھری ہوں گی۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَن كَانَ تَقِيًّا (پ ۱۶ - مریم ع)

یہی وہ جنت ہے جس کا ہم صرف ان لوگوں کو وارث بنائیں گے جو پرہیزگار ہوں گے۔

گویا کہ: یہ جنت ان کے حصہ میں آئے گی جو خود یہاں سے جنت لے کر جائیں گے، جن کی زندگیاں یہاں جنتیوں جیسی نہیں ہوں گی، ان کے لیے وہ جنت کہاں؟ سورۃ بنی اسرائیل میں آیا ہے۔

مَن كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (ع)

جو اس (دنیا) میں اندھا بنا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا۔

یعنی جس شخص نے حقائقِ دینیہ سے آنکھیں بند کیے رکھیں، اس کا یہاں بھی برا حال

ہوگا اور وہاں بھی۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (طٰہٰ ع)

اور جس نے ہماری یاد سے روگردانی کی، تو اس کی زندگی گھٹن میں گزرے گی اور قیامت میں بھی ہم اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔

بعض علماء نے آیت:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (سورہ رحمٰن)

(اور جو شخص اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرتا رہا، اس کے لیے دو باغ (بہشت) ہیں)

کے تحت لکھا ہے کہ حضرت امام ابن تیمیہ نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے۔

ان فی الدنیا جنة من لم يدخلها لم يدخل جنة الاخرة۔

اس دنیا میں (بھی) بہشت ہے، جو اس میں داخل نہ ہوا وہ اخروی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

یعنی وہ جنت وہی ہے جو یہاں سے لے کر جائے گا۔ جو جنت صرف وہاں کی پیداوار ہوگی، وہ تو بہت ہی مہنگی پڑے گی، پہلے دوزخ کی کٹھالی میں پڑنا ہوگا، جب وہ تمام میل کچیل اور نامناسب آلائشیں چھٹ جائیں گی جن کی وہ پاک سرزمین متحمل نہیں ہو سکتی تو پھر کہیں حکم ہوگا کہ اب اس میں داخل ہو سکتے ہو۔ غور فرمائیے کہ اب وہ کس بھاؤ پڑی۔

باقی رہی فی سبیل اللہ کی بہشت؟ سو وہ آپ جانتے ہیں کہ وہ تو ہمارے بابا آدم کو بھی راس نہیں آئی تھی ان کی اولاد کو کب راس آئے گی۔

ماہِ رمضان کے روزے بس اسی تطہیر (تقوے) کا فریضہ انجام دینے میں آپ کی مدد کو آئے ہیں۔ کہ آپ "بچ بچاؤ" کی پالیسی کے خوگر ہو جائیں، تاکہ جب آپ خدا کے حضور حاضر ہوں تو آپ صاف ستھرے ہوں اور ان تمام آلودگیوں اور تلوثات سے پاک ہوں جو دخولِ جنت میں کسی بھی درجہ میں ریکیں لگا سکتی ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (پ۲۔ بقرہ ع۲۳)

مسلمانو! جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر روزہ فرض کیا گیا تھا، ویسے ہی تم پر فرض کیا گیا ہے

تاکہ (نامناسب امور کے ارتکاب سے) بچو۔

روزوں کے سلسلے میں بعض امور سے پرہیز کرنے کے بعد فرمایا:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (ع ۲)

اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام لوگوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ (خلاف حکم کرنے سے) بچیں۔

یہ پرہیز یا بچاؤ کیا ہے؟ وہی عمل تطہیر جس کے ذریعے ایک انسان اپنے آپ کو گھٹیا طرزِ حیات سے پاک رکھ سکتا ہے۔ اس لیے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان مبارک کا نام شہر صبر بھی رکھا ہے وھو شهر الصبر والصبر ثوابه الجنة (ابن خزيمة عن سلمان) صبر کے معنی ضبطِ نفس، برداشت اور ہمت نہ ہارنے کے ہیں۔ حضرت امام ابن رجب لکھتے ہیں۔

صبر تین قسم کا ہے: ایک کا تعلق اللہ کی اطاعت سے ہے (کہ ہمت نہ ہارے اور ڈٹا رہے) دوسرے کا تعلق اللہ کے محارم سے ہے (کہ جن امور کو ممنوع قرار دیا گیا ہے وہاں ضبط نفس سے کام لے، ان کا ارتکاب نہ کرے۔ تیسرا یہ کہ راہِ حق میں جو تکالیف پیش آتی ہیں، ان کو برداشت کرے:

الصبر ثلاثة انواع: صبر على طاعة الله وصبر على محارم الله وصبر على اقدار الله المؤلمة (بغية الانسان ملخص)

جو روزے رکھ کر تطہیر کے اس فریضہ میں ناکام رہتے ہیں، ان کے متعلق رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

عطائے تو بر لقائے تو، یہ روزے اپنے گھر لے جاؤ، خدا کو ان روزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (رواه البخاری)

جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹے کام نہ چھوڑے اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانے پینے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

ابن ماجہ میں مزید ہے:

مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْجَهْلَ وَالْعَمَلَ بِهٖ۔

جس شخص نے جھوٹ بولنا اور جہالت (کا نہج) اور اس کے مطابق عمل نہ چھوڑا۔ تو خدا کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

زُور سے مراد ہر باطل اور خلافِ حقیقت بات ہے، مومن کا اصلی کام حقائق کی رہنمائی اور حقیقت کے خلاف جو راہ جاتی ہو اس کا سدِ باب کرنا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ خود ہی اس پر عمل پیرا ہے تو ظاہر ہے کہ روزہ سے اس کو کچھ حاصل نہ ہونا چاہیے! کیونکہ روزہ سے غرض بھی تطہیر اور امساک عن الباطل تھی، اگر وہ زُور اس کی زندگی میں اب بھی بدستور زندہ و تابندہ ہے تو یہی کہنا پڑے گا کہ یہ نِتی بھوکے مرنے والی بات ہے۔

جہل۔ نادانی اور جہالت کو جہل سے تعبیر کرتے ہیں، اس کی چند قسمیں ہیں۔

۱۔ ذہن کا علم سے خالی ہونا۔

۲۔ وہ افعال جو نظامِ طبعی کے خلاف جاری ہوں وہ بھی جہل کی شاخ ہیں۔

۳۔ خلافِ واقعہ کسی چیز کے متعلق رائے رکھنا۔

۴۔ کام کو جس طرح کرنا چاہیے، اس کے برعکس کرنا (راغب)

یہاں موخر الذکر تینوں مراد ہیں، اگر روزہ کے باوجود ان کا سلسلہ جاری ہے تو سمجھ لیجیے! سب کو پا کر کھو دیا۔

ایک اور روایت میں ہے:

مَنْ لَّمْ یَدَعِ الْخَنَا وَالْکَذِبَ (طبرانی۔ ابو ھریرۃ)

جس نے فحش گوئی، بکواس اور جھوٹ نہ چھوڑا۔

خنا۔ اصل میں "خنیٰ" ہے جس کے معنی فحش گوئی ہے۔ یعنی ایسی عریاں بات کہنا جو سنجیدگی متانت اور مقامِ عبدیت کے منافی ہو خنا کہلاتا ہے۔ روزہ کے بعد اگر سنجیدگی اور حیا کا دامن چھوٹ چھوٹ گیا تو اس نے خاک روزہ رکھا۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

لَیْسَ الصیام من الاکل والشرب انما الصیام من اللغو والرفث (ابن حبان۔ ابوھریرۃ)

روزہ کھانے پینے سے باز رہنے کا نام نہیں ہے، اصل روزہ لغو اور رفث سے باز رہنے کا نام ہے۔

لغو۔ واہی اور بے ہودہ بولنا اور بے ہودہ کام کرنا لغو کہلاتا ہے۔

رفث۔ رفث ہر وہ ناشائستہ حرکت ہے جو غلط اور ناجائز امور کے لیے انگیخت کرتی ہے۔ بالخصوص جو بات ناجائز جنسی تحریک کی موجب بنتی ہے اس کے ارتکاب کو "رفث" کہتے ہیں، روزہ جس ضبطِ نفس کی داغ بیل ڈالنا چاہتا ہے، ظاہر ہے یہ سب حرکتیں اس کے سخت منافی ہیں۔

یہ کہنا کہ روزہ سے غرض "کھانا، پینا" چھڑانا نہیں ہے۔ اس سے غرض یہ ہے کہ کھانا پینا برا نہیں ہے۔ اب نہیں تو ذرا ٹھہر کر آخر کار کھانا ہی پڑے گا۔ اصل میں کھانا پینا کم کر کے ان طبعی میلانات کا زور توڑنا مقصود ہے، جو فطری حدود کو پامال کر سکتا ہے۔ گویا کہ چند ثانیہ کے لیے ان کا چھوڑنا، ضبطِ نفس کے لیے ایک معاون مہیا کرنا ہے۔

غیبت۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مبارک عہد میں دو خواتین نے روزہ رکھا مگر شدتِ روزہ سے مرنے کو تھیں، حضور کو ان کا ماجرہ سنایا گیا تو آپ نے ان سے منہ پھیر لیا۔ پھر صحابی نے کہا۔ حضورؐ! بخدا وہ مرنے کو ہیں، اس پر آپ نے فرمایا ان دونوں کو بلاؤ، جب آگئیں تو آپ نے ایک برتن منگوایا۔ پھر دونوں سے فرمایا کہ: اس میں قے کرو، انھوں نے قے کی تو اس میں پیپ لہو اور گوشت کے تازہ ٹکڑے نکلے۔ آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا۔

اِنَّ هَاتَيْنِ صَامَتَا عَمَّا اَحَلَّ اللّٰهُ لَهُمَا وَاَفْطَرَتَا عَلٰى مَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا جَلَسَتْ اِحْدٰهُمَا اِلَى الْاُخْرٰى فَجَعَلَتَا تَاْكُلَانِ مِنْ لُحُوْمِ النَّاسِ (رواہ احمد عن رجل لم يسمع عن عبيد)

ان دونوں نے ان چیزوں سے روزہ رکھا تھا جن کو اللہ نے ان کے لیے حلال کیا ہے اور ان چیزوں سے روزہ توڑا ہے جن کو خدا نے ان پر حرام کیا ہے، وہ ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر لوگوں کا گوشت کھاتی رہیں (یعنی گلہ کرتی رہیں)

گو فقہاء نے چغلی کو مفسدِ روزہ قرار نہیں دیا تاہم ان کے نزدیک یہ ضیاعِ اجر کا موجب ضرور ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ان ارشاداتِ عالیہ سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ سے اصل غرض زندگی کے ان ذمائم اور رذائل کی تطہیر ہے جن کی وجہ سے ایک انسانیت داغدار آخرت بوجھل اور خدا سے بے تعلقی بڑھتی ہے۔ اس لیے آپ نے فرمایا کہ: اگر کوئی شخص روزہ دار کو برا بھلا کہے تو جوابی کارروائی سے پرہیز کرے اور یہ کہہ کر گزر جائے کہ: بھئی میں روزہ سے ہوں۔

فَاِنْ سَابَّكَ اَحَدٌ فَقُلْ اِنِّيْ صَائِمٌ (ابن خزيمة۔ ابو هريرة)

ایک اور روایت میں ہے کہ: اگر کوئی آپ کو برا بھلا کہے یا کوئی زیادتی کرے اور جہالت

سے پیش آئے تو کہے کہ : میں تو روزہ سے ہوں ۔

فَاِنْ سَابَّكَ اَحَدٌ اَوْ جَهِلَ عَلَيْكَ فَقُلْ اِنِّيْ صَائِمٌ (ابن خزیمہ - ابوھریرۃ)

دراصل ضبطِ نفس کا یہ اہم موقع ہے ، جب جذبات مشتعل ہوں ، اس وقت سنجیدگی ، انسانیت اور رضائے الٰہی کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کرنا نفس سے ایک بہت بڑا جہاد ہے ۔ اسی لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ : روزہ ایک ڈھال ہے ، جب تک کوئی اسے خود نہ پھاڑ ڈالے :

اَلصِّيَامُ جُنَّةٌ مَا لَمْ يَخْرِقْهَا (رواه النسائی - ابوعبیدۃ)

کسی نے پوچھا : پھاڑنا کیا ؟ فرمایا : جھوٹ بول کر یا غیبت اور گلہ کر کے ۔

وَبِمَ يَخْرِقُهَا ؟ قَالَ بِكَذِبٍ اَوْ غِيْبَةٍ (طبرانی - ابوھریرۃ)

آپ نے دیکھا ہوگا کہ :

روزہ بظاہر صرف کھانے پینے اور جنسی خواہشات کی تکمیل سے پرہیز کرنے پر زور دیتا ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ یہ سب امور "سلبی اور منفی" قسم کے ہیں ۔ رات کا قیام مسنون اور مفید ضرور ہے مگر روزہ کا حصہ نہیں ہے ، ہاں "ضبط نفس اور تطہیر کے لیے معاون ضرور ہے جیسے دوسرے اوراد و صدقات ۔ یہ دوسری شے ہے ۔

بہرحال بہشت پاک سرزمین ہے ، دیدارِ الٰہی کا مرحلہ اس سے بھی پاک تر ۔ اس لیے جو لوگ ان کے خواہش مند ہیں ، انھیں ، اپنے اندر ان صلاحیتوں کو اجاگر کرنا پڑے گا ، جو ان کو ایسی پاکیزہ ترین دولت کا اہل بنا سکے ۔ اگر کوئی شخص ایسا کرنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا تو پھر سمجھ لیجیے کہ وہ احکم الحاکمین کے مقدس دربار میں گندگی میں ملوث جسم کے ساتھ حاضری دینا چاہتا ہے ۔ اگر ایک شخص ایک معزز شہری کی مصفی اور ستھری قیام گاہ پر میلے کچیلے لباس اور متعفن جسم کے ساتھ جانے کو عقل و ہوش اور ذوق کا ماتم تصور کرتا ہے تو آخر وہ اس کو کیسے تصور کر سکتا ہے کہ رب العلمین کے پاک دربار میں انبیاء اور اتقیاء کے پاک دربار میں ، بایں رو سیاہی و رذائل ، حاضر ہونے میں کچھ باک نہیں ہے ــــــ ؟

بہرحال روزہ بندوں کو بھوکوں مارنے کی سکیم نہیں ہے ، بلکہ ان کو "بندہ" بنانے کی ایک مبارک تقریب ہے ، تاکہ جب وہ خدا کے حضور حاضر ہوں ، تو صاف ستھرا اور پاک و منزہ ہوں ایسی عفونت اور غلاظت کو دنیا میں ہی فنا کر کے پیش ہوں جو پاک ہستی کے پاک دیار اور

قدسی صفات شہر کی لطیف نزاکتوں کے لیے غارتگر ہو سکتی ہے۔

اگر روزہ دار نے روزہ کی اس حکمت اور روح کو سمجھ کر روزہ کو سینے سے لگایا تو یقین کیجیے! ماہِ رمضان کی یہ مبارک گھڑیاں ان کو وہ بال و پر عطا کر دیں گی جو ان کو اڑا کر جنت الفردوس کے مقامِ رفیع پر فائز کر دیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

یہ تطہیر، ابنِ آدم کی آدمیت اور انسان کی انسانیت کو جلا بخشتی ہے۔ قرب و وصال کی منزلیں طے کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور حق تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے سازگار فضا پیدا کر دیتی ہے ۔۔۔

جو لوگ روزہ کی اس غرض و غایت سے غافل رہ کر روزے رکھتے ہیں وہ شائد اس امر سے بے خبر ہیں کہ وہ صرف بھوکے اور پیاسے مر رہے ہیں۔ اس لیے رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نہایت افسوس سے فرمایا کہ:

بہت سے روزہ دار ہیں جن کو اپنے روزوں سے صرف بھوک اور پیاس حاصل ہوتی ہے اور بہت سے قیام کرنے والے ہیں جن کو صرف شب بیداری کی زحمت ہی نصیب ہوتی ہے۔

رُبَّ صَائِمٍ لَیْسَ لَہٗ مِنْ صِیَامِہٖ اِلَّا الْجُوْعُ وَرُبَّ قَائِمٍ لَیْسَ لَہٗ مِنْ قِیَامِہٖ اِلَّا السَّھَرُ (ابن ماجہ۔ ابو ھریرۃ)

جامع البیان (عربی)

للشیخ معین الدین بن صفی الدین الحسنی الحسینی الایجی الشافعی

حواشی : للشیخ محمد بن عبد اللہ الغزنوی

سائز ۹ × ۱۱½ صفحات ۸۹۲ سہ قلمی کتابت آفسٹ پیپر

ریگزین کی سنہری ڈائی دار جلد دونوں حصے یکجا مجلد ہدیہ ۔/۱۲۰ روپے

دینی مدارس کے اساتذہ و طلبہ کے لیے خصوصی رعایت کی جائے گی۔

ملنے کے پتے:
۱۔ دار نشر الکتب الاسلامیہ ۔ ۱۹ گورونانک پورہ، گوجرانوالہ
۲۔ اسلامک پبلشنگ ہاؤس ۔ شیش محل روڈ ۔ لاہور

الکتاب الحکیم

عزیز زبیدی۔ واربرٹن

زمین کتنی کیوں نہ ہو جائز ہے

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا وَفَجَّرْنَا خِلَالَهُمَا نَهَرًا ۝ وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا ۝ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ ۚ قَالَ مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا ۝ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ رُدِدْتُ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا ۝ لَٰكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ۝ وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ إِنْ تَرَنِ أَنَا أَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَوَلَدًا ۝ فَعَسَىٰ رَبِّي أَنْ يُؤْتِيَنِ خَيْرًا مِنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِنَ السَّمَاءِ فَتُصْبِحَ صَعِيدًا زَلَقًا ۝ أَوْ يُصْبِحَ مَاؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيعَ لَهُ طَلَبًا ۝ وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَىٰ مَا أَنْفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا ۝ وَلَمْ تَكُنْ لَهُ فِئَةٌ يَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ ۚ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَخَيْرٌ عُقْبًا ۝ (پ ۱۵۔ الکہف ع ۵)

ترجمہ: اور (اے پیغمبر) ان لوگوں سے ان دو شخصوں کی مثال بیان کرو جن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دے رکھے تھے اور ہم نے ان کے گرد اگرد کھجوروں کے درخت لگا رکھے تھے اور ہم نے دونوں (باغوں) کے بیچ بیچ میں کھیتی (بھی) لگا رکھی تھی، دونوں باغ اپنے پھل (خوب) لائے اور (پھل لانے) میں کسی طرح کی کمی نہ کی اور دونوں (باغوں) کے درمیان ہم نے نہر بھی جاری کر رکھی تھی تو باغوں کے مالک کے پاس (ہر وقت طرح طرح کی) پیداوار موجود رہتی تھی۔ ایک دن یہ شخص اپنے (کسی) دوست سے باتیں کرتے کرتے بول اٹھا کہ میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور (میرا جتھا (بھی) بڑا زبردست (جتھا) ہے اور (وہ یہ باتیں کرتا ہوا) اپنے باغ میں گیا اور (وہ ناحق غرور اور

خدا کی ناشکری سے) اپنے نفس پر آپ ہی ظلم کر رہا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ قیامت برپا ہو اور بالفرض (ہوئی بھی تو جب) میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جاؤں گا (بہر حال اس) دنیا سے (تو اس جگہ کی) بہتر ہی پاؤں گا۔ اس کا دوست جو اس سے باتیں کرتا جاتا تھا (دوران گفتگو) بول اٹھا کہ کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے جس نے تجھ کو پہلے مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا۔ لیکن میں تو (یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ) وہی اللہ میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہیں کرتا۔ اور جب تو اپنے باغ میں آیا تو تو نے (یوں) کیوں نہ کہا کہ یہ (سب) خدا کے چاہے سے ہوا ہے (ورنہ مجھ میں تو) بے مدد خدا کچھ بھی طاقت نہیں، اگر مال اور اولاد کے اعتبار سے تو مجھ کو اپنے سے کم سمجھتا ہے تو عجب نہیں میرا پروردگار تیرے باغ سے (بھی) بہتر (باغ) مجھ کو عطا فرمائے اور تیرے باغ پر (تیری) ناشکری (کی سزا میں) آسمان سے کوئی (ایسی) بلا نازل کرے کہ وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے یا اس کا پانی بہت نیچے اتر جائے اور تو اس کو کسی طرح طلب نہ کر سکے (چنانچہ عذاب نازل ہوا) اور اس (کے باغ) کی پیداوار (عذاب الٰہی کے) پھیر میں آگئی اور وہ لاگت پر جو باغ میں لگائی گئی، اپنے دونوں ہاتھ ملتا رہ گیا اور (باغ کا یہ حال ہو گیا کہ) وہ اپنی ٹٹیوں پر گرا ہوا پڑا تھا اور (مالک باغ) کہتا جاتا تھا کہ اے کاش! میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرتا۔ اور اس کا کوئی جتھا ایسا نہ ہوا کہ خدا کے سوا اس کی مدد کرتا اور نہ وہ (خود ہی) انتقام لے سکا۔ (اسی واقعہ سے (ثابت ہوا کہ) سب اختیار خدائے برحق ہی کو ہے، وہی بہتر ثواب دینے والا ہے اور (وہی آخر کار) بہتر عوض دینے والا ہے۔

ایک ایسا شخص جس کے پاس انگوروں کے دو باغ ہوں، ان میں کھیتی کا سلسلہ جدا ہو اور پھر اس قدر طویل سلسلہ ہو کہ ان میں نہر بھی ان کے لیے جاری ہو، اتنی بڑی زمینداری اور پھر حق تعالیٰ فرمائیں کہ ہم نے ان کو عطا کی تھی، اس امر کا بین ثبوت ہے کہ زمینداری اگر جائز کمائی اور محنت کا نتیجہ ہے تو طیب اور پاک ہے۔ ہاں اگر وہ زمینداری اور سرمایہ کے بل بوتے پر ملک و ملت اور عوام کے ساتھ نامناسب معاملہ کرتا ہے تو اس کو جرمانے اور ان کے خلاف مناسب تعزیریں قائم کی جا سکتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی رضا کے بغیر ان کی جائداد کو، کوئی بھی شخص اپنی تحویل میں لینے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہوگا کہ: اتنی بڑی سرکشی، طغیان اور غربا کے سلسلے میں ان کی اتنی بڑی بیدردی کے باوجود، حق تعالیٰ نے زمین کو اس کے حق ملکیت سے علیحدہ کرنے کا کوئی اعلان نہیں فرمایا۔

السنۃ والحدیث

مولانا عزیز زبیدی - واربرٹن

کمائی جائز ہو، تو وہ جائز ہے، خواہ کتنی ہو

حضورؐ کے عہد کے کارخانہ دار

عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا قَالَتْ لَمَّا اسْتُخْلِفَ اَبُوْبَکْرِ الصِّدِّیْقُ قَالَ لَقَدْ عَلِمَ قَوْمِیْ اَنَّ حِرْفَتِیْ لَمْ تَکُنْ تَعْجِزُ عَنْ مَؤُنَۃِ اَھْلِیْ وَشُغِلْتُ بِاَمْرِ الْمُسْلِمِیْنَ فَسَیَاکُلُ اٰلُ اَبِیْ بَکْرٍ مِنْ ھٰذَا الْمَالِ وَیَحْتَرِفُ لِلْمُسْلِمِیْنَ فِیْہِ (بخاری) باب کسب الرجل وعملہ بیدہ۔

(حضرت) عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ جب (حضرت) ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو فرمانے لگے کہ

میری قوم کو معلوم ہے کہ میرا پیشہ (کاروبار) میرے اہل وعیال کے معاش سے عاجز نہیں ہے اور (اب) میں مسلمانوں کے کام میں معروف ہو گیا ہوں اس لیے (اب) ابوبکر کے اہل وعیال (بیت المال کے) اس مال سے کھائیں گے اور وہ اس میں مسلمانوں کے کام کو انجام دے گا۔

طبقات ابن سعد (ص ۱۳۴) کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ:

حضرت ابوبکرؓ کپڑے کی تجارت کرتے تھے، مدینہ میں بھی مقام سنح میں ان کا کپڑے کا کارخانہ تھا (ارض القرآن ص ۱۳۴)

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی اپنے پیشہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس وقت کیا ہے جب خلافت پر متمکن ہونے کے بعد آپ کپڑوں کا گھٹا لے کر دکان کو چلے تھے اور حضرت عمرؓ نے روکا تھا (فتح الباری) گو یہ روایت بظاہر موقوف (صحابی کا اپنا طرزِ عمل) روایت ہے، تاہم یہ حکماً مرفوع ہے، کیونکہ انھوں نے اپنے جس پیشہ کا ذکر کیا ہے وہ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مبارک عہد کا واقعہ ہے۔

حدیث ابی بکر ھذا وان کان ظاھرہ الوقف لکنہ بما اقتضاہ من انہ قبل ان یستخلف

کان یحترف بتحصیل مؤنۃ اھلہ یصیر مرفوعًا لانہ یصیر کقول الصحابی کنا نفعل کذا علی عھد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (فتح الباری باب مذکور)

یہ کاروبار کافی وسیع تھا، چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے حضور کے عہد میں کاروباری تاجر کی حیثیت سے بصرے کا سفر بھی کیا۔

وقد روی ابن ماجہ وغیرہ من حدیث ام سلمۃ: ان ابا بکر خرج تاجرا الی بصری فی عھد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ (فتح الباری باب مذکور)

کارخانہ اور بصرہ تک تجارت کا سلسلہ کسی فرد واحد کا کام نہیں ہے۔ ظاہر ہے کچھ خدام اور مزدور بھی درکار ہوتے ہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ: یہ قدر زائد ہے، لہٰذا مزدوروں کا ہے، آپ کا اس میں کوئی حق نہیں۔ ان سے کارخانہ سرکاری تحویل میں نہیں لیا تھا۔

قدر زائد سوشلسٹوں کی ایک اصطلاح ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ کارخانہ میں مزدور محنت کر کے جو پیدا کرتا ہے، وہ ایسی زائد پیداوار ہے، وہ مزدور کا حق ہے کارخانہ دار کا نہیں۔

یہ ملحوظ رہے کہ: یہ کارخانہ اور وسیع کاروبار اس عہد کی بات ہے: جب دنیا ایک ایک لقمہ کو ترستی تھی اور تن ڈھانکنے کے لیے ایک ایک چیتھڑے کے لیے خون پسینہ ایک کر دیتی تھی۔

اپنی کمائی پاکیزہ کمائی ہے

عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنھا قالت:

قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اِنَّ اَطْیَبَ مَا اَکَلْتُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ الحدیث (رواہ الترمذی وغیرہ)

سب سے پاکیزہ تر وہ چیز جو آپ کھاتے ہیں، وہ ہے جو آپ کی اپنی کمائی ہے۔

کمائی کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، ہاتھ پاؤں کی جائز محنت، زبان اور کلام کی جائز کمائی، فکر و نظر کا جائز کسب ــــ اسلام کے نزدیک یہ سب کمائیاں تھوڑی ہوں یا بہت، رتیوں اور ماشوں کے حساب سے ہوں یا منوں اور ٹنوں کے حساب سے، سب پاکیزہ، طیب، پاک، جائز اور حلال ہیں۔ جائز کی قید ہم نے اس لیے لگائی ہے کہ:

ناجائز طریقے سے محنت کر کے جو کمائی کی جائے، اور وہ محنت کتنی ہی محنتِ شاقہ ہو، ناجائز اور حرام و ناپاک ہی رہے گی۔

کمیونسٹوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے، ان کے نزدیک فکر و نظر کی تو کچھ بھی قیمت نہیں، ہاں جانور

کی طرح جو زورِ بازو کے ساتھ محنت کی جائے گی وہ کمائی اس کی ہو گی، ذہنی اور فکری کاوش کا جو نتیجہ ہو گی، وہ اس کی نہیں ہو گی۔ یہ وہ ہوائی نظریہ ہے جو خود ان کے گھر میں بھی بار نہیں پا سکا۔ ان کے ملک کا ایک وزیرِ اعظم، اعلیٰ حکام، صدرِ مملکت جیسے منصب پر فائز لوگ جو سرتاپا ذہنی اور علمی و سیاسی بصیرت کی وجہ سے اونچے عہدوں پر چلے گئے ہیں، ان کی تنخواہیں ایک عام مزدور کی کمائی سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔

اس کے نظریہ کے تو یہ معنی ہوئے کہ، گدھے کو مالک سے زیادہ ملنا چاہیے، بلکہ جزوی اجرت تو بیشک مالک کو ملنی چاہیے کیونکہ وہ بھار ڈھوتا، جمع کرتا اور گدھے پر لادتا ہے، مگر جو مشقت اٹھانے جان جوکھوں میں ڈالنے اور مار کھانے کی گدھے کو برداشت کرنا پڑتی ہے، مالک کو اس سے کچھ بھی نسبت نہیں اس لیے باقی سارا گدھے کا ہونا چاہیے۔ یہی حال اونٹ اور ہل جوتنے والے بیلوں اور دوسرے جانوروں کا ہے۔

صحیح یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں جس طرح دوسری محنتوں اور صلاحیتوں کا احترام کیا گیا ہے، وہاں فکری اور علمی و ذہنی صلاحیتوں کو بھی خاص مقام بخشا گیا ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (زمر)

آپ کہہ دیں کہ کیا اہلِ علم اور جاہل برابر ہوتے ہیں؟

حضور کا ارشاد ہے کہ: نرے زاہد پر عالم کا ایسا درجہ ہے جیسا میرا تمہارے ایک آدمی پر۔

فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم (ترمذی۔ باہلی)

اس لیے اگر ایک شخص اپنی ذہنی صلاحیتوں اور بصیرت کے ذریعے کارخانوں یا عظیم جاگیروں کی تخلیق کر پایا ہے تو اس کا بہر حال احترام کرنا چاہیے۔ باقی رہیں اس سلسلے کی حماقتیں؟ سو ان کو دور کرنے کے لیے ممکن ذرائع ضرور استعمال کرنا چاہئیں لیکن ایسے نادان حکیم کی طرح نہیں جو درد سر کا علاج سر کو قلم کرنا ہی جانتا ہو۔

دودھ وہ بیچتی، آمدنی یہ لیتے

عَنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي مَرْيَمَ قَالَ كَانَتْ لِمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ جَارِيَةٌ تَبِيعُ اللَّبَنَ وَيَقْبِضُ الْمِقْدَامُ ثَمَنَهُ فَقِيلَ لَهُ:

سُبْحَانَ اللهِ أَتَبِيعُ اللَّبَنَ وَتَقْبِضُ الثَّمَنَ وَمَا بَأْسٌ بِذَالِكَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یقول لیاتین علی الناس زمان لا ینفع فیہ الا الدینار والدرھم

(رواہ احمد)

ابوبکر بن ابی مریم کہتے ہیں، حضرت مقدام بن معدیکرب کی ایک لونڈی تھی، دودھ وہ بیچتی تھی ایسے اس کے حضرت مقدام لے لیتے تھے، کسی نے اعتراض کیا کہ، دودھ (تو وہ بے چاری) بیچتی ہے اور پیسے آپ لے لیتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: ہاں! اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ میں نے رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا تھا، فرمایا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب پیسے دھیلے کے بغیر کام نہیں چلے گا۔

کمائی کوئی کرتا ہے مگر کھاتا کھلاتا کوئی ہے۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ لونڈی بجائے خود حضرت مقدام کی کمائی ہے۔ حضرت مقدام رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عظیم صحابی ہیں۔ ان کا طرزِ عمل اس امر پر شاہد ہے کہ جائز کمائی صرف بازوؤں کی کمائی کا نام نہیں، انسانی صلاحیتوں میں سے جس صلاحیت کا بھی نتیجہ ہو، وہ اس کی کمائی شمار ہوتی ہے اور پاک اور اس کا حق بنتی ہے۔

غلام کی کمائی کھاتے تھے

عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت کان لابی بکر غلام یخرج لہ الخراج فکان ابوبکر یاکل من خراجہ (رواہ البخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں، حضرت ابوبکر کے ایک غلام تھے جو ان کو مقررہ رقم دیتا تھا تو ابوبکر اس کی کمائی کھاتے تھے۔

اگر ایک انسان اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ لوگوں کو مزدوری مہیا کر کے کام لیتا اور کمائی کرتا ہے تو وہ بالکل جائز ہے اور یہ ایک ایسی حقیقتِ کبریٰ ہے جس کو کسی سے بھی مفر نہیں ہے۔ جو چیز جزوی طور پر جائز ہے، وہی شے اگر اجتماعی صورت اختیار کر لے تو آخر وہ کیوں جائز نہ ہو۔

حضورؐ کے عہد کا عظیم تاجر اور کروڑپتی

عن عبد الرحمٰن بن خباب: قال شہدت النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم وھو یحث علی جیش العسرۃ فقام عثمان فقال یا رسول اللہ علی مائۃ بعیر باحلاسھا واقتابھا فی سبیل اللہ ثم حض علی الجیش فقام عثمان فقال علی مائتا بعیر

بِأَحْلَاسِهَا وَأَقْتَابِهَا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ حَضَّ عَلَى الْجَيْشِ فَقَامَ عُثْمَانُ تَعَالٰى عَلَيَّ ثَلَاثُ مِائَةِ بَعِيْرٍ بِأَحْلَاسِهَا وَأَقْتَابِهَا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَأَنَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْزِلُ عَلَى الْمِنْبَرِ وَهُوَ يَقُوْلُ مَا عَلٰى عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذِهٖ مَا عَلٰى عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذِهٖ (ترمذی)

حضرت عبد الرحمان بن خباب فرماتے ہیں: میں رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ آپ غزوہ تبوک کے سلسلے میں لوگوں کو ترغیب دلا رہے تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھے اور کہا:

(حضور!) جھولوں اور کجاووں سمیت سو اونٹ محض رضائے الٰہی کے لیے میرے ذمے۔

آپ نے پھر لشکر کو مسلح کرنے کے لیے ترغیب دلائی تو (دوبارہ) حضرت عثمان اٹھے اور کہا:

(حضور!) جھولوں اور کجاووں سمیت دو سو اونٹ اللہ کی راہ میں میرے ذمے۔

آپ نے پھر لشکر کو تیار کرنے کے لیے ترغیب دلائی! تو حضرت عثمانؓ (تیسری بار بھی) اٹھے اور کہا۔

(حضور!) جھولوں اور کجاووں سمیت تین سو اونٹ اللہ کی راہ میں میرے ذمے۔

میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم یہ کہتے ہوئے منبر سے اتر رہے ہیں کہ اس کے بعد اگر عثمان اور کوئی (نفلی صدقہ خیرات جیسے) کام نہ بھی کریں تو بھی ان کا کوئی حرج نہیں ہوگا (دو بار ایسا ہی فرمایا)

مسند احمد کی ایک اور روایت ہے کہ انھوں نے جیش کی تیاری کے لیے ایک ہزار اشرفی کی تھیلی بھی حضور کو پیش کی تھی، جسے حضور خوش ہو کر جھولی میں لے کر اچھالتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس کے بعد عثمان اور کچھ نہ بھی کریں تو ان کا کچھ حرج نہیں ہوگا۔

یہ ۹ھ کا واقعہ ہے: جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ قیصر روم عرب پر حملہ کرنے والا ہے۔ یہ دن سخت تنگی ترشی کے تھے اس لیے اس کا نام "جیش العسرۃ" کا نام پڑ گیا، اسی مرحلہ پر انھوں نے ایک تہائی فوج کو پوری طرح مسلح کرنے کا ذمہ لیا تھا۔ چنانچہ ایک ایک تسمہ تک ان کی رقم سے خریدا گیا، اس کے علاوہ ایک ہزار اونٹ، ستر گھوڑے اور رسد کے لیے ایک ہزار اشرفی پیش کی (مستدرک حاکم و ترمذی)

ان روایات کے پیش کرنے سے غرض یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں جب کہ دنیا نانِ جویں کو ترستی تھی اس وقت بھی اتنے اونچے درجے کے مالدار اور سیٹھ موجود تھے جن کے پاس تجارتی ذرائع کے علاوہ زمینیں بھی تھیں، نیک خدمات کے عوض کچھ تو بطور جاگیر سرکار کی طرف سے ان کو زمینیں ملی تھیں اور کچھ انھوں نے خود بھی خرید لی تھیں، مدینہ منورہ میں ان کا نہایت عالی شان ایک سکان بھی تھا، یہ صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بات نہیں اور بھی بیسیوں صحابہ اور بھی متمول لوگ تھے۔

حضرت زبیر کے ایک ہزار غلام تھے (اصابہ) حضرت زبیر کی چار بیویاں تھیں۔ ان کو تیسواں حصہ میں گیارہ گیارہ لاکھ درہم ملا تھا اور تین کروڑ باون لاکھ کی جائداد چھوڑی تھی (ابن کثیر) حضرت طلحہ بہت بڑے تاجر ہونے کے ساتھ عظیم زمیندار بھی تھے، عراق میں ان کا زراعتی کاروبار بہت بڑا تھا (ابن سعد) حضرت حاطب بن ابی بلتعہ جب فوت ہوئے تو بہت بڑی نقدی اور متعدد مکانات چھوڑے تھے (طبقات ابن سعد) جب حضرت عبدالرحمان بن عوف کا انتقال ہوا تو ایک ہزار اونٹ، تین ہزار بکریاں سو گھوڑے اور لاکھوں اشرفیاں ورثہ میں چھوڑیں۔ آپ کی چار بیویاں تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کو ترکہ میں صرف بتیسواں حصہ ملا اور ہر ایک کے حصہ میں ایک ایک لاکھ آیا اور یہ وہ دولت تھی جو راہ خدا میں لٹانے سے بچ رہی تھی (ابن سعد) لیکن اس کے باوجود ان کی کسی بھی شئے کو سرکاری تحویل میں نہ لیا تھا۔ اور کسی نے ان سے یہ مطالبہ نہ کیا کہ: "یہ قدر زائد" ہے مزدوروں کا حق ہے۔ آپ کا نہیں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی سرکاری حیثیت میں اپنے عہد میں تعرض نہ کیا، نہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان اور علی رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں ان کو چھیڑا۔ نہ کسی سے زمین کا کوئی ٹکڑا چھینا، نہ کارخانے والے سے کارخانہ چھینا، نہ سرمایہ دار کا سرمایہ ضبط کیا، نہ مکانات کے مالکوں سے مکان چھین کر غریب پروری کا ڈھونگ رچایا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے جنھوں نے اپنے ملکی آئین کو انہی کے نقشِ قدم قائم کرنے کا اعلان کیا ہے وہ اگر اٹھ کر اس کی نئی طرح ڈالتے ہیں تو ہم دعا کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

باقی رہا سرمایہ داروں، جاگیر داروں اور کارخانہ داروں کی دھاندلیوں کا قصہ؟ سو اس کا یہ حل نہیں کہ ناجائز صورتِ حال کو کسی ناجائز طریقے سے ہی حل کیا جائے، حضور کا ارشاد ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْحُو السَّيِّئَ بِالسَّيِّئِ وَلٰكِنْ يَمْحُو السَّيِّئَ بِالْحَسَنِ إِنَّ الْخَبِيْثَ

لَا يَمْحُوا الْخَبِيْثَ (رواه احمد عن ابن مسعودؓ)

اللہ تعالیٰ برائی کو برائی کے ذریعہ نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو بھلائی سے مٹاتا ہے۔ کیونکہ خباثت خباثت سے دور نہیں ہوتی۔ (بلکہ وہ اور بڑھتی ہے)

ان دھاندلیوں کو خود دھاندلیاں کر کے ختم کرنا، کوئی معقول اور شرعی حل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ظلم تھیں تو یہ بھی ان سے مختلف نہیں رہیں، ظلم بہر حال ظلم ہوتا ہے، خواہ کسی بھیس میں ہو، حضور کا ارشاد ہے ایسا مال حلال نہیں ہے۔

خوش دلی کے بغیر مال حلال نہیں۔

عَنْ اَبِي حُرَّةَ الرَّقَاشِيِّ عَنْ عَمِّهٖ قَالَ قَالَ رسول الله صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: اَلَا لَا تَظْلِمُوْا اَحَدًا اَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ (مشکوٰۃ بحوالہ شعب الایمان للبیہقی والمجتبیٰ للدارقطنی)

حضورؐ نے فرمایا: خبردار! کسی پہ زیادتی نہ کرو! خوش دلی اور مرضی کے بغیر کسی شخص کا مال کسی شخص کے لیے حلال نہیں ہے۔

ساتوں طبق گلے میں ڈال دیے جائیں گے۔

عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِّنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا فَاِنَّهٗ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِيْنَ (بخاری ومسلم)

حضرت سعید بن زید فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ جس شخص نے بھی ظالمانہ طریقے سے کسی کی بالشت بھر زمین بھی لی تو قیامت میں وہ زمین ساتوں طبق تک اس کے گلے میں ڈال دی جائے گی۔

ان دونوں احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ لین دین کے معروف اور شرعی طریقے کے بغیر، مالک کی خوش دلی اور مرضی کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی کے لیے بھی اس کا مال جائز نہیں ہے۔ اس لیے اسلامی حکومت بھی مملکت کے ہر فرد کی ذاتی ملکیت کی حفاظت کی ذمہ دار اور ضامن ہوتی ہے، خواہ وہ کافر اور مشرک ہی کیوں نہ ہو، نا یہ کہ خود ہی دھاندلیوں کا دروازہ کھول لے۔ زمین اور کارخانے تو دور کی بات ہے، اسلام اور اسلامی حکومت اس امر کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ کوئی شخص کسی کی بکری کا دودھ بھی مالک کی مرضی کے بغیر دوہنے کی کوشش کرے۔

لَا يَحْلُبَنَّ اَحَدٌ مَاشِيَةَ امْرِئٍ بِغَيْرِ اِذْنِهٖ (مسلم عن ابن عمرؓ)

اگر مالک کی اجازت کے بغیر کسی کی زمین میں کسی نے کاشت کر بھی لی تو کاشت اسے نہیں دی جائے گی۔

مَنْ زَارَعَ فِي أَرْضِ قَوْمٍ بِغَيْرِ إِذْنِهِمْ فَلَيْسَ لَهُ مِنَ الزَّرْعِ شَيْءٌ (ترمذی عن رافع)

دولت اور سرمایہ اور ان کے ذرائع کو اگر معصوم اور پاکیزہ رکھا جائے تو وہ رحمت بردوش ثابت ہوتے ہیں، اگر وہ خبیث ہونے لگے ہیں تو ان کو پاک رکھنے کے لیے تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ ملک ملت کو ان سے فائدہ پہنچے۔ اگر اس کے بجائے ان کو یک قلم ختم کر دیا جائے تو حکومت کے کام بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اور کاروباری ذہن کے لوگ بھی ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ویسے بھی پوری قوم ایک ذہنی غلامی اور گھٹن میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

صحیح علاج یہ ہے کہ ملکی فضاؤں کو پاک رکھنے کے لیے مومنانہ محنت کی جائے، خدا خوفی، غریب پروری اور اللہ ترسی کی اقدار پیدا کی جائیں۔ اور ایسے حالات نہ پیدا کیے جائیں جن کی وجہ سے ایک کاروباری ناجائز ہتھکنڈوں پر مجبور ہو جائے

روٹی، کپڑا اور مکان کی نوید کے اب تک یہی معنی لیے گئے تھے کہ حکومت ایسے حالات اور ذرائع پیدا کر پائے گی، جس سے لوگوں کے لیے روٹی کمانے کے دروازے کھل جائیں گے: یہ تو کسی کے بھی ذہن میں بات نہیں آتی تھی کہ: لوگوں سے چھین کر لوگوں کو ممنون کیا جائے گا۔ ویسے بھی یہ عجیب منطق ہے کہ ایک چور اس لیے چوری کرے کہ میں غریبوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں، ایک جیب تراش یہ فلسفہ پیش کرے کہ اس سے لے کر میں یتیموں کی اعانت کروں گا، رشوت کا یہ فلسفہ بیان کیا جائے کہ میں غریب طلبہ کی تعلیم کے لیے وظیفے مہیا کروں گا تو کیا حکومت یا کوئی عقل مند ان کی اس حکمت اور فلسفہ کی داد دے گا؟

اصل میں "غربا" کا یہ جو علاج تشخیص کیا گیا ہے غریب پروری کے جذبہ پر کم، سیاسی مصالح پر زیادہ مبنی ہے۔ ہاں قرآن حکیم نے اس کا صحیح علاج یہ بتایا ہے کہ:

دولت کو گردش میں رکھا جائے تاکہ وہ کسی مخصوص طبقہ میں دائم ہو کر نہ رہ جائے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (پ ۲۸ - حشر ع ۱)

اس کی متعدد شکلیں ہیں، ان میں سے ایک وراثت کی ہے، دوسری زکوٰۃ کی ہے۔ تیسری عشر کی ہے، چوتھی خراج کی ہے، پانچویں جزیہ کی ہے، چھٹی وقف کی ہے، ساتویں ہبہ کی ہے، آٹھویں وصیت کی ہے، نویں حرمت سود کی ہے۔ دسویں ممانعت قمار اور سٹہ بازی کی ہے۔ گیارھویں

بیع وشراء میں حرمت فریب کی ہے۔

وراثت۔ اگر یہ جاری رہ جائے تو یہ دولت کسی ایک کی لونڈی بن کر نہیں رہ سکے گی۔ ماں باپ، بہن بھائی، بیٹا بیٹی علی ہذا القیاس یہ ایک چکر ہے، جس سے بچ کر دولت کسی گوشہ میں سمٹ نہیں سکے گی۔ خاص کر اگر رشتہ ناطوں کا دائرہ مومنانہ حدود تک وسیع کر دیا جائے تو پھر بات اور کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔

زکوٰۃ۔ جمع شدہ دولت کا چالیسواں حصہ نکلتا ہے تو بتلائیے! وراثت کے بعد دولت اور کتنا کسی کے پاس سر چھپائے گی؟

عشر۔ زمین کی پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصہ دے دیا جائے تو پھر کوئی کتنا قارون بن سکے گا؟ وراثت اور زکوٰۃ کے بعد اب زمین میں کتنی شوخی باقی رہ جائے گی۔

خراج اور جزیہ۔ یہ غیر مسلم اور مفتوحین پر عائد کردہ ٹیکس کا نام ہے۔ یہ حکومت اپنی صوابدید کے مطابق ان پر عائد کر سکتی ہے۔

وقف۔ وقف کے ذریعے ہزاروں اور لاکھوں مالیت کی جائدادیں عامۃ المسلمین کی دینی اور ملی ضروریات کے لیے اور محض اللہ کی رضا کے لیے وقف کر دی جاتی ہیں۔ غور کیجیے! اس کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔

ہبہ۔ حقوقِ واجبہ کے بعد یہ ایک رضا کارانہ ملی خدمت اور خلق خدا کے ساتھ ہمدردانہ معاملہ ہے اور یہ کوئی جتنا چاہے اور جتنوں کو چاہے دے سکتا ہے۔

وصیت۔ مرتے وقت اپنی جائداد کے تہائی حصہ کی وصیت کر سکتا ہے کہ یہ فلاں کارِ خیر میں صرف ہونی چاہیے۔

سود اور قمار۔ یہ وہ سفید ہاتھی ہیں، جنھوں نے بغیر کسی استحقاق کے دنیا کی دولت سمیٹنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اسے اگر ختم کر کے بیع مضاربت، بیع معاوضہ، بیع شرکتِ صنائع اور شرکت وجوہ جیسی فقہی سفارشات کو رواج دیا جائے تو قوم کے بہت خاندان اور افراد بھوکوں سے مرنے سے بچ جائیں بلکہ خوشحال ہو جائیں۔

فریب۔ بیع میں کم تولنا، ملاوٹ، کم ناپنا اور دوسری بد دیانتیوں کے سدباب کے لیے حکومت پورے اور مؤثر ذرائع استعمال کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک کی جھولی خالی رہے اور دوسرا تجوریاں بھر کر گھر کو لوٹے۔

الغرض: دولت شرعی شنفا رشات کے مطابق گردش کے راستہ پر ڈال دی جائے گی تو آپ کو سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف کسی اور دشمن کی تلاش کی ضرورت نہیں رہے گی، ورنہ بدنامی کے علاوہ پرنالہ بھی وہیں رہے گا جہاں کبھی تھا۔

دس سال صرف روٹی کپڑا

عن عتبة بن المنذر قال: كنا عند رسول الله صلى الله تعالى عليه وآله وسلم: فَقَرَأَ طٰسٓمٓ حَتّٰى بَلَغَ قِصَّةَ مُوسٰى عليه السلام قَالَ إِنَّ مُوسٰى عَلَيْهِ السَّلَام أَجَرَ نَفْسَهُ ثَمَانَ سِنِيْنَ أَوْ عَشْرًا عَلٰى عِفَّةِ فَرْجِهٖ وَطَعَامِ بَطْنِهٖ (رواه ابن ماجه)

کہا حضرت عتبہ نے ہم رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس تھے تو آپ نے (سورت) طٰسٓمٓ پڑھی یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصے تک جا پہنچے، (اس پر) فرمایا: اپنی پاکدامنی اور روٹی کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ یا دس سال کے لیے اپنے آپ کو مزدوری میں لگایا۔

حضرت شعیب علیہ السلام پیغمبر اور حضرت موسیٰ ہونے والے پیغمبر، دونوں نے اس امر پر معاہدہ کیا کہ آٹھ دس سال میری نوکری کرو تو ایک لڑکی نکاح کر دوں گا، حدیث سے پتہ چلا کہ اسی میں روٹی بھی طے پائی۔

غور فرمائیے! آٹھ دس سال کی نوکری اور ایک نوجوان، اپنی پوری ہمت کے ساتھ ان کی خدمت کرتا ہے، بکریاں چراتا ہے۔ گھر کے دوسرے کام کاج علاوہ کرتا ہے، کیا ان کا اتنا ہی بنتا ہے کہ اس کا اپنا ہی پیٹ پلے یا مزید اس امر کے سامان بھی تھے کہ اصل مالکوں کے دھندے بھی پورے ہوں؟ صحیح یہ ہے کہ مزدوری فرد کرے یا ایک جمعیت، وہ اپنی مزدوری کے عوضانہ کی حق دار تو ضرور ہے مگر اس سلسلے کا جو جائز منافع مالک کو ملتا ہے، وہ بھی اس کا جائز حق بنتا ہے۔ اس کا بھی احترام شرعاً لازم ہے۔

زائد زمین کاشت پر دینا جائز ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عليه وسلم عَامَلَ خَيْبَرَ بِشَطْرِ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا مِنْ ثَمَرٍ أَوْ زَرْعٍ (بخاری)

رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہود خیبر سے پھل اور اناج کی پیداوار کے آدھے حصے پر معاملہ کیا۔

چونکہ مدینہ کے لوگ زراعت پیشہ تھے، اور وہ سب اپنی کاشت سے زیادہ زمینیں دوسروں کو کاشت پر دیا کرتے تھے اور مہاجر صحابہ ہی بٹائی پر زمینیں لیتے تھے۔

مَا بِالْمَدِیْنَةِ اَھْلُ بَیْتِ ھِجْرَةٍ اِلَّا یَزْرَعُوْنَ عَلَی الثُّلُثِ وَالرُّبُعِ وَزَارَعَ عَلِیٌّ وَسَعْدُ ابْنُ مَالِكٍ وَعَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مَسْعُوْدٍ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ وَالْقَاسِمُ وَالْعُرْوَةُ وَاٰلُ اَبِیْ بَکْرٍ وَاٰلُ عُمَرَ وَاٰلُ عَلِیٍّ وَابْنُ سِیْرِیْنَ الحدیث (بخاری)

مدینے میں مہاجرین کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جو تہائی اور چوتھائی پر بٹائی نہ کرتا ہو، حضرت علی، سعد بن مالک، عبداللہ بن مسعود، عمر بن عبدالعزیز، حضرت قاسم، عروہ، خاندانِ ابوبکر، خاندانِ عمر، خاندان علی اور ابن سیرین (سب) بٹائی کرتے تھے۔ (بخاری)

صحیح مسلم میں ہے کہ صحابہ کے پاس کچھ زائد زمینیں تھیں۔

قال جابر بن عبد اللہ: کان لرجال فضول ارضین من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (مسلم باب کراء الارض)

ان روایات سے پتہ چلا کہ زمینیں یا دوسری املاک زائد بھی ہوں تو انہی مالکوں کا حق ہے جنھوں نے کمائیں۔ وہ چاہیں تو مزدوروں، مزارعوں یا دوسرے اجیروں سے کام کرائیں یا خود ہی سارا سنبھالیں۔ زائد املاک دیکھ کر لوگوں کے پیٹ میں جو مروڑ اٹھتے ہیں وہ ان کی تنگ ظرفی کی نشانی ہے کوئی علمی یا اصولی بات نہیں تھی۔

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ نے مزارعت یا ٹھیکے پر دینے سے منع فرمایا تھا مگر وہ بعض جزوی خرابیوں کے انسداد کے لیے تنبیہاً اور تہدیداً فرمایا تھا تاکہ وہ باہم جھگڑیں نہیں یا مالک بٹائی کے حصہ کے علاوہ پیداوار کا مخصوص حصہ لے کر جو زیادتی کیا کرتے تھے، اس سے منع فرمایا تھا۔ صحابہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ ہاں اگر حکومت جائز خدمات کے عوض کسی کو کچھ زمین یا خطہ عطا کرتی ہے اور وہ شخص اسے آباد نہیں کر سکا تو حکومت کو اب اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کا حق حاصل ہے جیسا کہ حضرت مازنؓ کے واقعہ سے مترشح ہوتا ہے۔

چالیس روز میں

ناظرۂ قرآن، دورۂ قرآن اور خصوصی دینی تعلیم کا پروگرام پچاس سالہ تجربہ کا حاصل کامیاب طریقۂ تعلیم۔ تفصیلات کے لیے حسب ذیل پتہ پر لکھیے۔

جنرل سیکرٹری انجمن خدام اسلام۔ شاہ دین بلڈنگ شاہراہ قائداعظم۔ لاہور

دارالافتاء

عزیز زبیدی - واربرٹن

تراویح — نعمت البدعۃ ھذہ

ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ:

رمضان مبارک آ رہا ہے، یہ عبادت کا مہینہ ہے مگر لوگ رکعتوں کا جھگڑا کر کے بدمزہ کر دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ:

۱۔ صحیح کتنی رکعتیں ہیں؟ کیا ان سے کم و بیش بھی پڑھی جا سکتی ہیں؟

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس نماز کو بدعت کیوں کہا ہے۔ اچھی سہی، بہرحال حضور نے جب پڑھی ہیں تو پھر بدعت کیوں؟

۳۔ کیا صحابہ نے بیس پڑھی ہیں؟ کیا ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے؟

الجواب

واقعی یہ ماہ، ماہِ عبادت ہے لیکن لوگوں نے اسے اکھاڑہ بنا ڈالا ہے، ہم نے اس موضوع پر ان لوگوں کو بھی جھگڑتے دیکھا ہے جو تراویح تو کجا ہے سے نماز ہی نہیں پڑھتے، اور جو پڑھتے ہیں وہ رکعتوں کی تعداد پوری کرتے ہیں۔ قیام لیل (شب زندہ داری) کا فریضہ انجام نہیں دیتے۔ وہ بیس خواں ہوں یا آٹھ پڑھنے والے۔ اس حمام میں سب ننگے ہیں اور یہ بات کسی کو یاد نہیں کہ وہ نماز اتنی لمبی ہوتی تھی کہ ان کو سحری کے فوت ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا تھا۔ (قیام اللیل) مگر ہمارے مدعیوں کا حال یہ ہے کہ تراویح کو صرف ایک گھنٹہ دیتے ہیں — انا للہ

۱۔ صحیح اور ثابت آٹھ رکعت ہیں:۔

(۱) حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معمول سدا گیارہ رکعتیں تھا۔ آٹھ تراویح، تین وتر۔

یصلی اربعًا فلا تسئل عن حسنھن وطولھن ثم یصلی اربعًا فلا تسئل عن حسنھن وطولھن ثم یصلی ثلثا (بخاری باب قیام النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

باللیل فی رمضان وغیرہ ملخصاً)

آپ چار رکعتیں پڑھتے، پر وہ کتنی حسین اور طویل ہوتیں، بس نہ پوچھیے! پھر چار پڑھتے، پر وہ کتنی حسین اور طویل ہوتیں، بس نہ پوچھیے! پھر حضور تین رکعتیں پڑھتے الخ (بخاری شریف ص ۱۵۴)

اس میں ہے کہ، حضور کا یہ معمول رمضان اور غیر رمضان، دونوں میں یہی تھا۔ رمضان میں ہوں تو انہیں قیام رمضان (تراویح) کہتے ہیں۔ اگر غیر رمضان میں ہوں تو انہیں نماز تہجد (قیام اللیل) کہتے ہیں۔ تہجد سو کر پڑھی جاتی ہے تراویح میں اس کی قید نہیں ہے۔ ہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کے پچھلے حصے میں تراویح پڑھنے کو ترجیح دیتے تھے (قیام اللیل) لیکن یار دوستوں نے رکعتوں پر تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام کی بڑی تسبیح پڑھی ہے اور دونوں نے ہی حد کر دی ہے لیکن اس روح اور اسوہ کی پرواہ نہیں کی، جو انہیں زیادہ محبوب تھی۔

سائل نے حضرت عائشہؓ سے نماز رمضان کا سوال کیا ہے مگر حضرت عائشہ نے مزید غیر رمضان کا بھی بتا دیا کہ فرق صرف نام کا ہے، کام ایک ہے۔ یعنی گیارہ رکعت، ایسا نہیں کہ تراویح پڑھ کر الگ تہجد بھی پڑھی ہو۔ (العرف الشذی شرح ترمذی علامہ انور شاہ کشمیریؒ)

باقی رہا یہ مسئلہ کہ، انھوں نے صرف رکعتیں پوری کی تھیں یا ان پر جان بھی چھڑکی تھی؟ فرمایا، کہ یہ نہ پوچھیے! بس اتنی لمبی کہ حد کر دی تھی۔ اب یہ آپ غور فرمائیں کہ اس مسئلہ پر لڑنے مرنے پر اتر آنے والوں نے کبھی اس روح اور سرور کی تلاش بھی کی کہ شروع کیں تو پھر چھوڑنے کو ان کا جی ہی نہ کرے؟

(ب) حضرت انس فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس حضورؐ تشریف لاتے اور نماز پڑھاتی مگر ہلکی کر کے، پھر گھر تشریف لے گئے اور لمبی کر کے پڑھی، پھر تشریف لائے اور ہلکی نماز پڑھائی، پھر گھر تشریف لے گئے اور لمبی کر کے پڑھی۔ صبح ہم نے پوچھا تو فرمایا:

ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خرج علیھم فی رمضان فخفف بھم ثم دخل فاطال ثم خرج فخفف بھم ثم دخل فاطال الخ (مسند احمد۔ مسند انس ص ۱۵۵ ج ۳)

حضور کا ارشاد ہے کہ رات کی نماز دو دو رکعتیں ہیں (بخاری)

صلوٰۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ (صحیحین عن ابن عمر)

باقی کی روایت میں چار چار کا ذکر بطور استراحت کے ہے کہ ہر چار رکعت کے بعد آپ دم لیتے تھے۔

يصلي اربع ركعات في الليل ثم يستريح فاطال حتى رحمته (بيهقي ص۴۹ ج۲)

حضرت انسؓ نے جس طرح دو پھیرے ذکر کیے ہیں اس حساب سے ان کو شمار کیا جائے تو آٹھ ہی رکعتیں بنیں گی، دو باہر آکر، دو گھر جاکر، پھر دو باہر آکر اور پھر دو گھر جاکر۔ آٹھ رکعتیں بنیں۔

(ج) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے شب رمضان میں آٹھ رکعت پڑھائی تھیں

صلى بنا رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم ليلة في رمضان ثماني ركعات والوتر الحديث (ميزان الاعتدال)

امام ذہبی فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد درمیانی ہے (اسنادہ وسط ص۳۱۱ ج۲)

امام طبرانی کہتے ہیں، اس روایت میں یعقوب منفرد ہے مگر وہ ثقہ ہے۔ معلوم ہوا کہ عیسیٰ بن جاریہ منفرد نہیں ہے۔ اس لیے ذہبی نے اسنادہ وسط کہا ہے۔

(د) حضرت ابی بن کعب کا ارشاد ہے کہ میں نے حضور سے ذکر کیا کہ حضور میں نے خواتین کو آٹھ رکعتیں پڑھائی ہیں، آپ راضی رہے۔

فصليت بهن ثمان ركعات واوترت فكانت سنة الرضا (ابويعلى قال الهيثمي اسناده حسن، تحفة الاحوذي ص۴ ج۲)

آثار صحابہ و تابعین

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابی بن کعب اور حضرت تمیم داری کو گیارہ رکعت پڑھانے کا حکم دیا تھا۔

امر عمر ابي بن كعب، تميما الداري ان يقوما للناس في رمضان باحدى عشرة ركعة (رواه مالك في الموطا)

(ی) حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں کچھ بزرگ سنت سے مشابہت کے لیے آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے۔

انه كان بعض السلف في عمر بن عبدالعزيز يصلون باحدى عشرة ركعة قصدا التشبيه برسول الله صلى الله عليه وسلم (ما ثبت من السنة محدث دهلوی ص۱۵۱)

باقی رہا کم و بیش پڑھنا، بہر حال منع نہیں ہے۔ ہاں زیادہ ثواب اسی میں ہے کہ حضورؐ کی سنت کا اتباع کیا جائے اور رکعتوں کی تعداد پر زور دینے کے بجائے اس کی کیفیت پر زور دیا

جائے تو اور بہتر رہے گا۔ کیونکہ جو چیز مطلوب ہے۔ وہ یہی روح ہے کہ یوں چپٹ جائیں کہ سحری کے فوت ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو جائے۔ یہ وہ تراویح ہیں جو رنگ لاتی ہیں۔ بہرحال اسلاف میں کم و بیش جو تراویح پڑھی گئی ہیں صرف اس لیے کہ بندش نہیں ہے۔ بعض آثار میں تراویح چار رکعت بھی آئی ہیں۔ لیکن آپ حیران ہوں گے کہ اتنی لمبی پڑھیں کہ انھیں میں سحری ہو گئی۔

چار رکعت: عن حذیفۃ انہ صلی مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ذات لیلۃ فی رمضان فرکع فقال فی رکوعہ سبحان ربی العظیم مثل ما کان قائما ثم سجد فقال فی سجودہ سبحان ربی الاعلیٰ مثل ما کان قائما ثم جلس یقول رب اغفرلی رب اغفرلی مثل ما کان قائما ثم سجد فقال سبحان ربی الاعلیٰ مثل ما کان قائما فما صلی الا اربع رکعات حتی جاء بلال الی الغداۃ (النسائی ص۱۹۸ قیام اللیل ص۹۰)

حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رمضان میں ایک رات حضور کے ساتھ نماز پڑھی، پھر رکوع کیا، اس میں قیام کے برابر سبحان ربی العظیم پڑھی، پھر سجدہ کیا اس میں بھی قیام کے برابر سبحان ربی الاعلیٰ پڑھی، پھر اٹھے اور درمیان میں بیٹھ کر "رب اغفرلی رب اغفرلی" قیام کے برابر پڑھتے رہے پھر اسی طرح سجدہ میں "سبحان ربی الاعلیٰ" پڑھی۔ بس چار ہی رکعت پڑھ پائے تھے کہ سحری کے لیے حضرت بلال آ گئے۔

امام نسائی فرماتے ہیں یہ روایت منقطع ہے۔ ہاں روات سب ثقہ ہیں۔ واللہ اعلم۔ بہرحال تابعین اور صحابہ کے عہد میں کم و بیش پڑھی گئی ہیں۔ اس کی تعداد پر سر پھٹول اچھی نہیں بلکہ رات بھر قیام کر کے اور سنت کے مطابق ان کو ادا کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

دوستوں نے بیس رکعت کے لیے جو مرفوع روایات پیش کی ہیں وہ ایک بھی صحیح نہیں ہیں، ہم نے جو ذکر کی ہیں، ان میں زیادہ تر مرفوع اور قابلِ احتجاج روایات ذکر کی ہیں۔ اس لیے حضور کے عمل کے مقابلے میں دوسرے کا عمل پیش کرنا اصولاً اور دیانۃً غلط ہے۔ ایسے بھی جب صحیح حدیث موجود ہو تو بہانے بنا کر اس سے گریز کرنا خدا کے ہاں انسان اس سے بری الذمہ نہیں ہو جاتا۔

اس موضوع پر ہمارے دو رسالے موجود ہیں، منگوا کر مزید مطالعہ فرمالیں۔ ایک کا نام ہے (۱) القول البدیع فی مسئلہ التراویح (۲) دوسرے کا نام التلویح بتوضیح التراویح ہے۔

اچھی بدعت۔ نعمت البدعۃ۔ بدعت کے جو معنی یہاں بیان کیے گئے ہیں، ہم ان سے مطمئن

نہیں ہیں، ہمارے نزدیک اس کے معنے صرف معروف بدعت کے نہیں بلکہ واہ وا کے بھی ہیں۔
کہ یہ کیا ہی کمال شے ہے؛ لسان العرب میں ہے:

رجل بدع وامرۃ بدعۃ اذا کان غایتہ فی کل شیئ (لسان العرب)

یہی معنی یہاں ہیں کہ: نعمت البدعۃ ہذہ یعنی یہ کیا ہی کمال شے ہے۔

اس لیے جو بات ذہن میں کھٹکتی تھی، وہ صحیح نہیں تھی۔

عبدالرحمٰن عاجز مالیر کوٹلوی

خار بھی تیری راہ کے پھول ہیں تیری راہ میں

تجھ سا کریم و مہرباں کوئی نہیں نگاہ میں
لایا مجھے کشاں کشاں دل تیری بارگاہ میں

لطفِ گناہ قلیل تر رنجِ گناہ طویل تر
ایک گناہ گار نے پایا یہی گناہ میں

دین بہت ہے قیمتی جاہ و جلال دہر سے
دین نہ دے تُو ہاتھ سے شوقِ جلال و جاہ میں

دل میں نہ کوئی مدعا لب پہ نہ کوئی التجا
غرق ہوئی ہیں چاہتیں آپ کی ایک چاہ میں

حسنِ یقین سے دل ترا اب بھی جو بہرہ مند ہو
اب بھی فغاں میں رنگ ہو اب بھی اثر ہو آہ میں

تیرے ہر ایک کام سے ہے وہ خبیر باخبر
دن کی وہ روشنی میں ہو یا وہ شبِ سیاہ میں

دونوں جہاں کے خوف سے اس کو پناہ مل گئی
تیرے کرم سے آ گیا جو بھی تیری پناہ میں

شاہ و گدا ہر ایک پر طاعتِ حکم فرض ہے
فرق نہیں خدا کے ہاں کچھ بھی گدا و شاہ میں

گرد بھی تیری راہ کی سرمہ ہے میری آنکھ کا
خار بھی تیری راہ کے پھول ہیں تیری راہ میں

تیری خوشی کے واسطے دشمنِ دیں کے سامنے
عاجزِ خوش نوا بھی اب آ گیا رزم گاہ میں

پروفیسر غلام احمد حریری

عربی زبان وادب پر قرآن کریم کے اثرات

ظہورِ اسلام سے پہلے زندگی کا تصوّر محدود تھا۔ اسلام کی آمد سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ خیالات و افکار میں انقلاب آیا۔ قرآن کے آفاقی تصوّر نے زندگی کے افق کو وسیع کر دیا۔ اس انقلاب سے ہر شعبۂ حیات متاثر ہوا۔ قرآن کے زیرِ اثر علم وفن کے بہت سے نئے زاویے بنے۔ شعروادب اور زبان پر بھی قرآن کے خوشگوار اثرات پڑے۔ قرآن مجید نے ادب میں حریتِ فکر، وسعتِ نظر، پاکیزگیٔ تخیّل اور بلندیٔ معنی کے اوصاف پیدا کیے۔ ادب عربی قرآن مجید سے قبل لفظی حسن وشوکت کا مرقع تھا اور اس کا مقصد محض جذباتِ سافلہ کی ترجمانی تھی۔ قرآن مجید نے آکر ادبِ عربی کو صوری ومعنوی حسن کے ساتھ جذباتِ عالیہ کی ترجمانی کے آداب سکھائے۔ یہ قرآن مجید کی تعلیم ہی کا فیضان ہے کہ آج عربی زبان تمام دنیا کے علوم وافکار سے معمور ہے۔ عربی زبان وادب کا محور قرآن مجید ہے۔

ادبِ جاہلی کا جو سرمایہ آج محفوظ شکل میں مل رہا ہے وہ سب قرآن مجید کی زبان کو محفوظ کرنے اور اسے سمجھنے کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ مثلاً لسانی خامیوں کے سدِباب کے لیے علم صرف ونحو واشتقاق، قرآنی اعجاز کو ثابت کرنے کے لیے معانی اور بیان وبدیع، غریب الفاظ کی شرح وتوضیح کے لیے لغت وادب، احکام شرعیہ کے استنباط کے لیے حدیث، تفسیر، اصول اور فقہ وغیرہ علوم معرضِ وجود میں آئے۔ پھر قرآن مجید نے ان تمام علوم کو باقی رکھا اور اکنافِ عالم تک پہنچایا۔

تاریخ ادب عربی کا مطالعہ کرنے والا دیکھے گا کہ یہ زبان جن نازک مرحلوں سے معجزانہ طور پر جان بچا کر نکل آئی یہ محض قرآن مجید کی قوت کا نتیجہ تھا۔ ورنہ دنیا کی بے شمار زبانیں اس سے بھی کمتر صدمات کی تاب نہ لا کر زندگی کھو بیٹھیں اور صفحۂ کائنات سے مٹ گئیں۔

قرآن مجید نے الفاظ ومعانی کے ضمن میں عربی زبان کی امکانی وسعتوں کو آشکارا کیا۔ اثر آفرینی کے سلسلہ میں حقائق پسندی، نفع بخشی اور افادی ہمہ گیری کو ملحوظ رکھنے کا درس دیا۔

حقیقت پسند ادب کا عقلی نمونہ پیش کرتے ہوئے اس قدیم مقولہ کی تردید کر دی کہ "اَعْذَبُ الشِّعْرِ اَکْذَبُہٗ" (شعر جس قدر کذب پر مبنی ہوتا اتنا ہی شیریں ہوتا ہے) قرآن مجید نے ادب کا رُخ عدل و انصاف "خدمتِ انسانیت" تائیدِ حق و صداقت، نفاست پسندی، عفت و حیا اور خدا پرستی کی طرف پھیر دیا۔ اس نے ہر موضوع کو بیان کرنے کے لیے مناسب و پروقار اسالیب بخشے، غور و فکر اور دلائل و براہین سے کام لینے کی دعوت دی۔

قرآن مجید نے بتایا کہ ادب کا فریضہ یہ ہے کہ وہ طیبات کو معاشرہ میں مقبول بنائے اور خبائث کے لیے معاشرہ کی فضا ناسازگار بنا دے۔ قرآن مجید نے ادب کو یاس و قنوط کے مہلک جراثیم سے نجات دلا کر اسے جہادِ مسلسل، اور حیات آفرین رجائیت کا داعی بنایا تنقید کے لیے بلند اصول دیئے اور "احسن" کو اختیار کرنے میں کسی قسم کا تعصب نہ کرنے کی تلقین کی اس نے مدح و ہجو کے لیے نئے پیمانے مقرر کیے اور "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" کا بلند ترین معیار عطا فرمایا۔

قرآن مجید نے عربی ادب میں حقائق کا اس طرح خمیر اٹھایا کہ اس کے بعد جس زبان میں بھی کسی شکل سے عربی ادب پہنچا۔ اس خمیر کی تائید نے اس زبان کو بھی فکری و معنوی بلندیوں سے ہمکنار کر دیا۔ آج دنیا کے ادب میں وحدتِ عالم، وحدتِ انسانیت، حریت فکر اور اخلاق کی جو حوصلہ افزائی ہو رہی ہے وہ اسی قرآنی ادب کی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ اگر آج انسانیت اپنی آنکھوں سے تعصبات کی عینک اتارنے کی کوشش کر رہی ہے تو یہ قرآنی ادب کے فیض کا ثمرہ ہے۔ عربی زبان پر قرآن کریم کا اثر یہ ہوا کہ اس نے عربوں کے سخت اور بے رحم دلوں میں جاگزیں ہو کر انھیں نرم کر دیا۔ اور ان کی سطحی عقلوں میں داخل ہو کر انھیں ذہنی اور ٹھوس بنا دیا۔ چنانچہ قرآن مجید کے اس اصول نے ان کی زبان میں حسین الفاظ، خوبی تراکیب، نزاکتِ اسلوب، قوت گویائی، زورِ بیان، نیرنگیٔ معانی، کثرتِ مضامین و مطالب کی صفات کو جنم دیا۔ زبان کے دائرہ کو نئے دینی الفاظ تراش کر مثلاً "الصلوٰۃ" الزکوٰۃ، القیام، الرکوع، السجود، القنوت، الوضوء، المومن، الکافر و دیگر الفاظ تک وسعت دی۔

قرآن مجید سے عربی نثر جس درجہ فیض یاب ہوئی شاعری اس حد تک متاثر نہ ہو سکی خلفائے راشدین کے عہد میں عجیب فتوحات بڑھیں، اسلامی مملکت کی حدود میں وسعت آئی اور سیاسی و عمرانی مسائل میں اضافہ ہوا تو نثر کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ قرآن کے فیض و اثر نے اس دور کے طرز

نثر نگاری کو پرکیف سادگی عطا کی۔ خلفائے اسلام کے یہاں خط وکتابت کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں سہل ممتنع کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جو قرآن کے زیر اثر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کریم کی بدولت عربی نثر کا پایہ عربی شاعری کی بہ نسبت بہت بلند ہو گیا۔

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعر و شاعری بھی قرآن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ اسلام کی آمد سے شعراء کے فکر وفن کا مقصد بدل گیا اور ان کی شاعری اسلام کی ہمہ گیر تحریک سے وابستہ ہو گئی۔ حضرت حسانؓ، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ کے کلام میں اسلامی شعور نمایاں ہے۔ لبید بن ربیعہ جیسے عظیم جاہلی شاعر کا یہ حال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہونے کے بعد شاعری ترک کر دی۔ حضرت عمرؓ نے جب اس سے اشعار سننے کی فرمائش کی تو بولا کہا کہ اللہ تعالیٰ نے شعروں کے عوض مجھے سورۃ البقرہ دے دی ہے۔ (تاریخ الادب العربی احمد حسن زیات ذکر لبید بن ربیعہ و دیگر کتب تاریخ ادب عربی)

حضرت حسان اپنے دور کے عظیم شاعر تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ عربی شاعری اسلام کے ہمہ گیر نظام حیات کو مکمل طور پر اپنے اندر سمو نہ سکی۔ حیرت ہے کہ اسلام کے آفاقی تصور کو رومی اور اقبال نے اپنے کلام میں جس طرح جذب کیا اس کی مثال صدرِ اسلام سے لے کر دورِ عباسی بلکہ دورِ جدید تک کے عربی شعراء میں کہیں نہیں ملتی۔ تاہم عہدِ اسلام کے شعراء کے کلام کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فن کا وہ منبع یا اسلوب نہیں رہا جو دورِ جاہلیت کا خاصہ ہے۔ دورِ اسلام میں قرآن کریم کے زیر اثر جو شاعری پروان چڑھی کلام جاہلیت کے مقابلہ میں اس کا انداز نرم اور لطیف ہے۔ زبان شستہ، پاکیزہ اور نکھری ہوئی ہے۔ طرزِ ادا ستھری اور دلنشین ہے۔ سوقیت و ابتذال کم یاب ہے۔ بقول ابن خلدون "مسلم فن کاروں کا فن نظم و نثر کلام جاہلیت سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

قرآن مجید کو عربوں کی زندگی میں مختلف پہلوؤں سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کے بعد محض تشریعی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ان کی زبان، ادب اور ذہنی رجحانات کا بھی محور بن گیا۔ عربی زبان و لغت کی تدوین، اشعار کی تلاش و تحقیق، اسالیب بیان کے ارتقاء اور مختلف فنونِ ادب کے پروان چڑھنے میں قرآن مجید ہی سب سے بڑا محرک تھا۔ عربوں نے قرآن کا مطالعہ مختلف طریقوں سے کیا ہے۔ یہاں اس مطالعہ کا صرف ایک پہلو یعنی جو کچھ قرآن مجید کی زبان اور اسلوب بیان پر لکھا گیا ہے مَیں اسے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ قرآن مجید کے محاسن زبان پر بیشمار کتابیں لکھی گئی تھیں اور علماء نے یہ ثابت

کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کے اعجاز کا اصل مظہر اس کی زبان اور بلاغت ہے۔ اس سے عربی تنقید کو بہت فائدہ پہنچا۔ علماء نے نہ صرف قرآن مجید ہی کی زبان سے وقیع اور مفید بحثیں کی ہیں بلکہ وہ عربوں کی عام زبان اسالیب بیان، جاہلی و اسلامی شعراء کے اشعار عربوں کی روایات نحو، علم بدیع، علم بیان، علم معانی اور لغت وغیرہ کے دقیق مسائل کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن فہمی کے لیے عربی علوم و فنون کا عمیق مطالعہ درکار ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ کا خیال ہے کہ جب تک عرب قبل اسلام کی شاعری کا تحقیقی مطالعہ نہ ہوا ور عربی بلاغت پر نظر نہ ہو اس وقت تک کما حقہٗ قرآن مجید پر نظر نہیں ہو سکتی۔

قرآن مجید اور عربی تنقید دونوں میں ایک بہت قریبی تعلق ہے اور جن لوگوں نے قرآن مجید کی زبان و اسلوب بیان پر کتابیں تصنیف کی ہیں وہ سب کے سب ناقد ادب تھے اور ان میں سے اکثر ایسے بھی ہیں جنھوں نے عربی تنقید پر الگ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔

تیسری صدی ہجری میں عربی تنقید کے متعلق بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ اس سے قبل کی کوئی کتاب موجود نہیں۔ اسی دور سے ناقدین عرب نے قرآن کی جانب بھی توجہ کی۔ مشہور نحوی فراءؒ نے ایک کتاب "معانی القرآن" کے نام سے لکھی۔ ابوعبیدہ نے "مجاز القرآن" تصنیف کی اور تیسری صدی کے مشہور ناقد ابن قتیبہ نے "مشکل القرآن" لکھی۔ یہ تینوں کتابیں ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں۔ ابن قتیبہ مشکل القرآن میں کہتے ہیں کہ قرآن کی عظمت کا عرفان اسی کو ہو سکتا ہے جس کی نظر میں وسعت ہو۔ جس کا علم عمیق ہو اور وہ عربوں کے مختلف اسالیب بیان و مکتب ہائے فکر سے واقف ہو۔

تمام ناقدین عرب نے بلا کسی استثناء کے قرآن مجید سے مثالیں پیش کی ہیں۔ قدامہ بن جعفر نے بہت کم آیات بطور مثال کے اپنی کتاب "نقد الشعر" میں پیش کیں۔ مگر چوتھی ہی صدی ہجری کے ایک دوسرے ناقد ابوالحسن اسحاق بن وہب الکاتب نے اپنی مشہور کتاب "البرہان فی وجوہ البیان" میں بے شمار قرآنی آیات سے استشہاد کیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس نے نظریات تو اخذ کیے ارسطو سے مگر مثالیں دیں قرآن سے۔ ارسطو کی کتاب الجدل اور کتاب الخطابۃ کے اثرات مذکورہ بالا کتاب پر بالکل واضح ہیں۔ یہ عجیب طرز تھا کہ عرب ناقد ارسطو اور دوسرے یونانی مفکرین سے نظریات و اصطلاحات اخذ کر کے ان کے لیے مثالیں قرآن مجید اور احادیث سے تلاش کرتے تھے۔ چنانچہ ابن معتز نے تیسری صدی ہجری میں، ابن وہب الکاتب نے چوتھی صدی ہجری میں اور عبد القاہر الجرجانی نے پانچویں صدی ہجری میں بالکل یکساں طریقہ اختیار کیا۔

چوتھی صدی ہجری کے اواخر سے پانچویں صدی اور اس کے بعد کے اکثر ناقدوں نے اپنی کتاب کے دو مقاصد قرار دیئے۔ ایک دینی مقصد اور دوسرا ادبی۔ انھوں نے قرآن مجید میں تنقید کی بنیادیں تلاش کیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح انھوں نے جاہلی شاعری وغیرہ کو مرکز توجہ بنایا۔ چنانچہ ابوالہلال عسکری نے اپنی کتاب "الصناعتین" کے مقدمہ میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ میری کتاب کے دو اہم مقاصد ہیں۔ ایک ادبی خدمت اور دوسری دینی خدمت، بالکل یہی انداز ابن سنان خفاجی نے سر الفصاحۃ میں اختیار کیا ہے۔ عبدالقاہر جرجانی نے تو مستقل دو کتابیں ہی ان دونوں مقاصد پر لکھیں۔ بلاغت پر ان کی کتاب "اسرار البلاغۃ" بہت مقبول و مشہور ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی زبان اور اس کے محاسن پر ان کی دوسری کتاب "دلائل الاعجاز" غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ ان دونوں کتابوں میں انھوں نے جہاں مثالیں اشعار و ادب سے دی ہیں وہاں قرآن مجید سے بھی پیش کی ہیں۔

اس سلسلہ میں انھوں نے ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ جاحظ نے تیسری صدی ہجری میں ایک بحث یہ اٹھائی کہ کلام میں حسن کا مرجع الفاظ ہیں یا معانی؟ انھوں نے الفاظ کو معانی پر ترجیح دی تھی اور بتایا تھا کہ معانی تو دیہاتی، شہری اور جاہل سب ہی جانتے ہیں اصل حسن تو الفاظ کے قالب ہی میں ہے۔ عبدالقاہر جرجانی نے اس نظریہ کی تردید کی اور کہا کہ حسن الفاظ میں نہیں معانی میں پوشیدہ ہے "دلائل الاعجاز" میں انھوں نے اس نظریہ کو اس طرح پیش کیا کہ قرآن میں بھی حسنِ کلام کا مرجع الفاظ میں نہیں معانی میں ہے اور معانی میں بھی براہِ راست نہیں بلکہ نظمِ معانی میں کیفیتِ حسن پوشیدہ ہے۔ ابو تمّام کی شاعری عربوں کے مالوف طرزِ شاعری سے مختلف تھی۔ اس میں استعارے، تشبیہات نئے مضامین اور نئی تراکیب کثرت سے استعمال کی گئی تھیں اور ساتھ ہی فلسفیانہ خیالات بھی کسی حد تک پیش کیے گئے تھے۔ یہ ایسی چیزیں تھیں جن سے عربوں نے اجنبیت محسوس کی اور عرب ناقد دو طبقوں میں منقسم ہو گئے۔ بالکل یہی صورتِ حال متنبّی کے ساتھ بھی پیش آئی اس لیے کہ اس نے بھی ابو تمام کا طرز اختیار کیا اور اس سے بہت آگے بڑھ گیا اور اس کے بارے میں نقادِ عرب دو گروہوں میں بٹ گئے۔ صاحب بن عباد اور حاتمی وغیرہ نے بہت کچھ اس کے خلاف لکھا۔ مگر قاضی جرجانی اور ثعالبی وغیرہ نے اس کی موافقت میں بہت اچھے انداز سے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا۔

ابو تمّام کی شاعری کے اختلافات سے دراصل "علم بدیع" کا آغاز ہوا۔ اس لیے کہ اس کی بیشمار اقسام کا استعمال اس کی شاعری میں ہوا تھا۔ اس وقت یہ عام خیال تھا کہ یہ بالکل ایک نیا علم ہے جو عربوں میں یونانیوں سے آیا ہے۔ ابن معتز (متوفی ۲۹۶ھ) نے کتاب البدیع تصنیف کی اور اس

میں یہ نظریہ پیش کیا کہ "علم بدیع" عربوں کے یہاں ایام جاہلیت سے موجود ہے اور تمام عرب جدید و قدیم شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں بھی موجود ہے۔ ابن معتز نے کثرت سے قرآنی آیات سے استشہاد کیا ہے۔

"مذہب بدیع" کے حامیین نے قرآن مجید سے خاص طور سے کیوں مثالیں پیش کیں؟ اس کا جواب زغلول سلام نے یہ دیا ہے کہ اس طرح انھوں نے یہ کوشش کی کہ جو کچھ ابو تمام اور ان کے مقلد شعراء نے کیا تھا اس کو صحیح ثابت کریں۔

علم بدیع کے علاوہ علم بیان اور معانی پر بھی قرآن مجید کے اثرات پوری طرح نمایاں ہیں۔ اور بیشمار آیات ناقدین عرب نے قرآن مجید سے پیش کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلوب کا اصل معیار ہمیشہ قرآن مجید رہا ہے اور ناقدوں نے اس کا خاص خیال رکھا ہے کہ قرآن مجید نے کس انداز سے اور کن الفاظ و تشبیہات کے ذریعہ مفہوم کو ادا کیا ہے اور اس کو معیار حسن و بلاغت سمجھا ہے۔

"اعجاز القرآن" پر رمانی (متوفی ۳۸۴ھ) اور خطابی (متوفی ۳۸۸ھ) کی کتابیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ رمانی کی دس اقسام بدیع مشہور ہیں۔ ان کو ابو بکر باقلانی نے بھی اپنی کتاب "اعجاز القرآن" میں نقل کیا ہے۔ یہ اقسام دراصل چوتھی صدی میں معروف ہو چکی تھیں۔ ہاں بعض اختلافات البتہ قابل ذکر ہیں۔

۱۔ رمانی نے اطناب اور تطویل کا فرق اعجاز القرآن میں واضح کیا ہے۔

۲۔ تلاؤم اور اس کی مختلف قسموں اور تنافر کے درمیان فرق کو بھی انھوں نے بیان کیا ہے۔

۳۔ تواصل کی تشریح کر کے اس کا اور "اسجاع" کا فرق بھی نمایاں کیا ہے۔

۴۔ "مناسبت" کا بھی بیان اعجاز القرآن میں موجود ہے۔

۵۔ تصریف کی تشریح بھی رمانی نے کی ہے۔

اعجاز القرآن پر سب سے بہتر کتاب ابو بکر باقلانی کی ہے۔ انھوں نے اس بحث میں بیشمار مسائل تنقید کو اپنا مرجع قرار دیا ہے، ان کا طرز استدلال یہ ہے کہ پہلے کسی مسئلہ کو لے کر اس کی دقتوں کو بیان کرتے ہیں پھر شعراء عرب کو دکھلاتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے اس بارے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں وہ نمونہ پیش کیا ہے جس سے تمام شعراء و اہل زبان عاجز ہیں۔

باقلانی کہتے ہیں کہ کلام مختلف حیثیت کا ہوتا ہے کچھ بلند اور کچھ پست۔ ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف انتقال فنکار کی عظمت کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور اکثر لوگ اس شکل میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ مگر قرآن مجید کی عظمت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس میں ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف اس طرح انتقال ہو جاتا ہے کہ کوئی بھدا پن اور غیر مناسب عبارت ظاہر نہیں ہوتی اور ایک عجیب حسن وکشش اس حیثیت سے قرآن مجید میں نظر آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکثر شعراء نے اس میدان میں ٹھوکر کھائی ہے۔ چنانچہ بحتری جیسا عظیم شاعر جب "نسیب" سے مدح کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اکثر بہت بھدا انداز اختیار کر لیتا ہے اور بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ (فنی نقطۂ نظر سے (اعجاز القرآن ابو بکر باقلانی ص ۵۶-۵۷)

باقلانی کا خیال ہے کہ ایک شاعر ایک صنف میں تو غیر معمولی اہمیت اور عظمت کا حامل ہوتا ہے مگر جب وہی کسی دوسری صنف سخن پر طبع آزمائی کرتا ہے تو بہت ہی گر جاتا ہے اور کم ایسا ہوتا ہے کہ شاعر تمام اصناف میں یکساں حیثیت رکھتا ہو۔ اس طرح بعض فن کار نثر میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں مگر جب وہ شاعری میں قدم رکھتے ہیں تو بہت نیچے گر جاتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔

اپنے اس نظریہ کے پیش نظر وہ شعرا کی مندرجہ ذیل اقسام بیان کرتے ہیں۔

۱۔ کچھ شاعر ایسے ہیں جو "مدح" کے بادشاہ ہیں مگر ہجو میں بالکل صفر ہیں۔

۲۔ کچھ ایسے ہیں جو ہجو بہترین کرتے ہیں مگر مدح میں ان کا کوئی مقام نہیں۔

۳۔ بعض شعراء کو تقریظ (مدح) میں ید طولیٰ حاصل ہوتا ہے مگر وہ تابین (مرثیہ) میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

۴۔ کچھ شعراء تابین (مرثیہ) میں سبقت رکھتے ہیں مگر تقریظ (مدح) نہیں کر پاتے۔

۵۔ اس طرح بعض شعراء صف میں بہت ممتاز ہوتے ہیں، اونٹ، گھوڑے، رات کے چلنے شراب پینے، جنگ کی تصویر کشی اور غزل کے رقیق موضوعات کے بیان کرنے میں بہت ممتاز ہوتے ہیں۔ اس موقع پر باقلانی عربی تنقید کی مشہور مثل کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عربوں نے یہ تبصرہ اس صلاحیت کی بنیاد پر کیا تھا کہ "امرؤ القیس" سب سے بڑا شاعر ہے جبکہ وہ اونٹ پر سوار ہو۔ نابغہ زبیانی سب سے بڑا شاعر ہے جب کہ وہ خوف زدہ ہو جائے اور زُہیر اس موقع پر سب سے بڑا شاعر ہے جب کہ وہ لالچ اور طمع محسوس کرے۔ اعشی اس

دقت سب سے بڑا شاعر ہے جب کہ اس نے پی لی ہو اور خوش ہو۔ (اعجاز القرآن باقلانی صفحہ ۵۴)

عربی تنقید کے مشہور مسئلہ سے وہ تعرض کرتے ہیں اور الفاظ و معانی کی بحث پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ بہترین کلام وہ ہے جس میں معانی الفاظ کے موافق ہوں اور کلام لفظ و معنی کے لحاظ سے باہم مطابقت رکھتا ہو، ان دونوں عناصر میں سے کسی کی زیادتی نہ ہو۔ جب یہ کیفیت ہوگی تو فن و فصاحت کو زیادہ بہتر انداز سے نمایاں ہونے کا موقع ملے گا۔ اس موقع پر باقلانی بڑی دلچسپ بحث کا آغاز کرتے اور کہتے ہیں کہ جن و بھی اشعار کہتے ہیں۔ انھوں نے جنوں کے سترہ اشعار نقل کر کے لکھا ہے کہ وہ بھی قرآن کے مثل کلام کہنے سے عاجز ہیں۔ باقلانی نے پہلے یہ بتایا ہے کہ عمدہ کلام کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں:۔ کلام میں حسب موقع طوالت و اختصار ہو۔ استعارہ تصریح اور تحقیق ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اوصاف قرآن کریم میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ (اعجاز القرآن ص ۶۲)

باقلانی نے ایک باب میں قرآن میں "سجع" کے وجود کی نفی کی ہے وہ کہتے ہیں کہ "سجع" میں معنی لفظ کے تابع ہو جاتے ہیں جب کہ قرآن میں الفاظ معانی کے تابع ہیں۔

احمد صقر نے اس نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سجع" کی مذکورہ تعریف صحیح نہیں ہے۔ اس طرز کا استعمال تو کمزور فن کاروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ سجع کی اعلیٰ قسم وہ ہے جس میں الفاظ کو ان کی موزوں و مناسب جگہ بھی ملتی ہے اور وہ معانی کے تابع بھی ہوتے ہیں۔ یہی وہ "سجع" کی قسم ہے جو اپنی مکمل شکل میں احادیث میں وارد ہوئی ہے اور اس کو وہ لوگ جو "سجع" کے قائل ہیں قرآن مجید میں ثابت کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جو مسجع کلام قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے وہ کلام کی اعلیٰ ترین قسم ہے اور بلاغت کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے (اعجاز القرآن للباقلانی مع مقدمہ از سید احمد صقر ص۸۵)

باقلانی ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ بلاغت کا انحصار بدیع کی عمدہ شکلوں کے استعمال، لطیف معانی، عمدہ حکمتوں اور مناسبت اور یکسانیت کلام پر ہے جو قرآن مجید میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ آگے چل کر وہ مزید کہتے ہیں کہ بہترین کلام وہ ہے جس کو کان اپنا سرمایہ سمجھیں اور نفس انسانی اس کی جانب پوری طرح متوجہ ہو جائے اور جس کی رونق دور سے اس طرح نظر آ جائے جیسے موتیوں کے ہار کی چمک۔ حسنِ کلام کی یہ صفت پہلے ہی جملہ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ باقلانی نے آسان اور سلیس کلام ہی کو معیار قرار دیا۔ غریب، وحشی اور مستکرہ کلام کو ناپسند کر کے اچھے کلام کی تعریف اس طرح کی کہ جب تم اس کو سنو تو وہ تمہارے دل میں بیٹھ جائے اور تم کو ایسی حلاوت و خوشگواری

محسوس ہو جیسی کہ تم آبِ زلال پیتے وقت محسوس کرتے ہو لیکن اس کے باوجود وہ کلام تمہارے اختیار سے اتنا ہی دور ہو جیسے ستارہ کو ڈھونڈھنے والے سے ستارہ دور ہو جاتا ہے۔

ایسا کلام نفس سے قریب تر اور ذہن سے مانوس ہوتا ہے مگر اس کا کہنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر باقلانی پر تبصرہ کرتے ہیں کہ تمام ادباء و شعراء نے غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے، صرف قرآن مجید کی زبان غلطیوں سے مبرّا ہے۔

باقلانی نے قرآن سے شعر کی نفی کی ہے، ان کا خیال ہے کہ شعر وہی ہے جو موزوں، مقفّٰی ہو اور اجزاء میں تناسب ہو اور وہ متساوی ہوں۔ اس کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ "شعر منثور" کے بھی منکر تھے۔

شاعری کے متعلق ان کا نظریہ تھا کہ بلا قصد کے وہ وجود میں آئی۔ جب لوگوں نے اس کو دیکھا تو بہت پسند کیا اور اس انداز پر کلام کہنے کا رواج عام ہوا۔ ان کی نظر میں منظوم کلام منثور کلام سے بہتر اور فصیح ہوتا ہے۔ (اعجاز القرآن ص۲۳۶)

باقلانی ایک موقع پر رقمطراز ہیں کہ حسنِ کلام کا اصل مرجع انسانی طبیعت ہے۔ جو بات عمداً کہی جائے اس میں وہ لطف نہیں ہوتا جو کیفیتِ حسن بلا قصد کے محاسن کلام کے استعمال ہو جانے میں ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں باقلانی ایک اور حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ موجودہ دور (یعنی پانچویں صدی ہجری) میں لوگ آورد کے ذریعہ محاسنِ کلام کے شائق ہو گئے ہیں حالانکہ متقدمین کے یہاں ان محاسن کا ذریعہ آمد تھی اور ان کا استعمال اتفاق سے ہو جاتا تھا۔

تعجب تو یہ ہے کہ باقلانی نے نہ صرف یہ کہ زبان، شاعری، خطبات اور نثر وغیرہ کے تنقیدی مسائل سے بحث کی ہے بلکہ ناقد کے فرائض اور فنِ تنقید کے بارے میں بھی بہت سی قیمتی آراء کا اظہار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ صرّاف کی نظر جس طرح سونے پر ہوتی ہے اور بزاز کی نگاہ جس طرح کپڑے کو پہچانتی ہے بالکل اسی طرح ناقد کی نظر کلام پر بہت گہری ہوتی ہے۔ اسی انداز سے باقلانی ناقدوں کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں اور مختلف مسائل پر بحث لاتے ہیں۔ یہ ایک مفصل نمونہ تھا ان کتابوں میں سے ایک اہم کتاب کا جو اعجاز القرآن پر لکھی گئیں۔ اس سے بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے دقیق تنقیدی مباحث کا اثر عربی تنقید پر پڑنا ایک ناگزیر حقیقت ہے۔

باقلانی کہتے ہیں کہ تمام عربی شاعری میں غلطیاں موجود ہیں اور اس سلسلہ میں امرؤ القیس کے قصیدہ کے ایک ایک شعر کو لے کر اس کی غلطیاں واضح کرنے کی کوشش کی ہے، وہ تنقید اس لحاظ

سے اہم ہے کہ اس کے بعد انھوں نے قرآن مجید کی زبان اور اس کے بیان کے محاسن کا تفصیل سے ذکر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن کی زبان سب سے اہم اور اعجاز کا نمونہ ہے جس سے انسان عاجز ہیں (اعجاز القرآن صفحہ ۲۴۹)

قرآن مجید پر جن لوگوں نے لکھا اور اس کی زبان اور اس کے اسلوب پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی ان سب ناقدوں یا علماء نے کوئی ایک ہنج اپنی بحثوں میں اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے ذہن و خیال اور اپنے زمانہ کے تنقیدی رجحانات کے پس منظر میں انھوں نے قرآن مجید کے محاسنِ زبان کو سامنے لانے کی کوشش کی اس بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ ڈاکٹر زغلول سلام کا یہ نظریہ صحیح نہیں کہ عربوں کے دو مکتبِ فکر تھے وہ علم تنقید میں "مذہب بدیع" اور "مذہب عربی" کو دو اہم تنقیدی رجحانات سمجھتے ہیں۔ یہ تقسیم تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں دونوں مکتب ہائے فکر کا صحیح نقشہ موجود نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ پاتے کہ "مذہب بدیع" قرآن سے دور رہا اور "مذہب عربی" کا مرکز قرآن مجید رہا۔ بلکہ طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ قرآن اصحاب بدیع کا محور بن گیا اور انھوں نے جتنے بھی تنقیدی پیمانے بنائے ان کا معیار قرآن اور اعجاز قرآن کو قرار دیا اور اس راہ سے ہٹ گئے۔ جس کی جانب علماء اعجاز قرآن نے ان کو توجہ دلائی اور بتایا کہ قرآن مجید کے اسلوب میں محض فنونِ بدیع ہی اس کی عظمت کے حامل نہیں، بلکہ اس کے پس منظر میں معانی اور روحِ بیان وغیرہ ہیں جو ایک توازن اور کشش کی ضامن ہیں۔ (اثر القرآن فی تطور النقد الادبی ص ۳۳۷)

قرآن مجید کو علمِ بدیع کے حامیوں نے اپنے اوپر اعتراضات سے بچنے کے خیال سے مرجع بنایا اور یونانیوں سے نظریات اخذ کر کے انھیں قرآنی مثالوں کے ساتھ پیش کیا۔ اس سے یہ ایک بڑا فائدہ ہوا کہ ایک جانب عربی تنقید میں نظریاتی پہلو کا اضافہ ہوا۔ اس لیے کہ اب تک جو تنقید عربوں کے یہاں موجود تھی وہ دراصل عملی تنقید تھی اور سطحی فکر و ذوق پر منحصر تھی۔ اس طرح عربوں میں ایک بلند اور نظریاتی و فکری تنقید کی بنیاد پڑی۔ دوسری جانب عربی تنقید کو یہ فائدہ پہنچا کہ قرآن مجید کے استشہاد کی وجہ سے عربوں نے کچھ دن ضرور غیر عربی خیالات سے اجنبیت محسوس کی اور آمدی نے قدامہ کے نظریات کے خلاف کتاب لکھی۔ اور میرا خیال ہے کہ ان لوگوں نے جنھوں نے اعجازِ قرآن پر کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے عرب مکتبِ فکر اور یونانی مکتبِ فکر دونوں کے اختلافات سے قطع نظر کر کے قرآن مجید کے محاسن کو اجاگر کرنے کے لیے دونوں خیالات سے فائدہ اٹھایا جیسا کہ باقلانی کی کتاب سے محسوس ہوتا ہے۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ زغلول سلام نے قرآن پر اس حیثیت سے غور نہیں کیا کہ علماءِ اعجاز قرآن خود کسی مسلک کے حامل نہ تھے بلکہ اپنے دور کے مروجہ تمام مسالک سے وہ قرآن مجید کے محاسن کو واضح کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر مذہبِ عربی کا مرکز صرف قرآن ہی ہوتا تو آمدی کے یہاں ہم کو علم بدیع اور اس کی اقسام نظر نہ آتیں، خود باقلانی نے بدیع اور اس کی تمام سے بحث کی ہے اور اس کے ذریعہ قرآن مجید کی عظمت کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس بحث سے میرا مطلب یہ ثابت کرنا ہے کہ علماء اعجاز قرآن کا کوئی الگ مکتبِ فکر عربی تنقید میں نہ تھا بلکہ وہ مذکورہ دونوں تنقید کے اسکولوں سے استفادہ کرتے تھے، اس طرح یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ عربی تنقید کے دونوں مکتب ہائے فکر پر قرآن مجید کے اثرات نمایاں ہیں اور یہ نظریہ صحیح نہیں کہ کوئی بھی مکتبِ فکر قرآن مجید سے دور رہا۔

زغلول سلام نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بدیع مکتبِ فکر کا مرجع چونکہ یونانی خیالات تھے لہذا وہ قرآن مجید کے اثرات سے دور رہا۔ اس کے برعکس عربی مکتبِ خیال کے ناقدوں نے اپنا مرجعِ فکر قرآن مجید کو بنایا اور قرآن مجید کے اسالیبِ بیان ہی کو مضبوطی سے پکڑے رہے، عربی تنقید میں یہ خالص قرآنی طرزِ فکر ان کی نظر میں بدیع اسکول اور یونانی خیالات کا عملی طور پر ردِ عمل تھا اور بدیع مکتبِ فکر کے مقابلہ میں عربی مکتبِ فکر وجود میں آیا (اثر القرآن فی تطور النقد الادبی ص ۲۳۳)

یہ تو ایک بدیہی امر ہے کہ عربی تنقید کے تمام مکاتب فکر نے قرآن مجید سے استشہاد کیا ہے اور اس کو زبان و بیان کا نمونہ بنایا ہے، مجھے تعجب ہوتا ہے کہ عربوں کے جس خالص مکتبِ فکر کی جانب زغلول سلام اشارہ کرتے ہیں۔ اس میں تو ذرا بھی کہیں قرآن کا اثر نمایاں نہیں ہے۔ مثلاً تیسری صدی ہجری میں ابن قتیبہ نے "الشعر والشعراء" میں جو تنقیدی بحثیں کی ہیں ان میں تمام استشہاد قدماء و متاخرین کے اشعار سے کیا گیا ہے۔ یہی حال ابو العباس ثعلب کی "قواعد الشعر" کا ہے۔ آمدی اور قاضی جرجانی جن کو ڈاکٹر محمد مندور خالص عرب ناقد قرار دیتے ہیں، وہ بھی "موازنہ" اور "وساطہ" میں قرآن سے استشہاد نہیں کرتے بلکہ واقعہ تو یہ ہے "قرآن مجید کو نمونہ کے طور پر جن لوگوں نے پیش کیا ان میں اکثریت انھیں ناقدوں کی ہے جن کا تعلق مذہبِ بدیع سے ہے" (النقد المنہجی عند العرب ص ۶۸)

ثعلب اور ابن قتیبہ بھی قرآن ہی کو اپنا مرجع و ماخذ سمجھتے تھے لیکن شاعری پر بحث کے دوران انھوں نے قرآن مجید کو مثالاً نہیں پیش کیا جب کہ بدیع اسکول کے ناقدوں نے اپنی کتابوں میں عربی شاعری اور قرآن مجید دونوں ہی سے مثالیں تلاش کیں۔ ابن قتیبہ نے "مشکل القرآن" میں قرآن مجید کی زبان کو دنیا

کی تمام زبانوں پر ترجیح دی اور افضل بتایا ہے (اثر القرآن ص ۱۱۹)

زغلول کے نظریہ پر ہیں نے اس لیے بحث کی تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان کی نکر میں بدیع یا یونانی اسکول تنقید سے وہ تعصب موجود ہے جس کا ابو تمام کے زمانہ سے اکثر عرب ناقد شکار رہے ہیں ورنہ قرآن مجید کے اثرات تو عربی تنقید کے بنیادی عناصر میں ہیں جن سے پوری عربی تنقید نے قوت اور توانائی حاصل کی ہے۔

کتابُ الصَّوم

مشکوٰۃ المصابیح

کی کتابُ الصَّوم پر مشتمل

۱۴۷ احادیث نبوی کی بصیرت افروز تشریحات کا گرانقدر مرقع

از

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

مرتبہ

حفیظ الرحمٰن احسن

ایم۔اے اسلامیات کے طلباء کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ

★ سفید کاغذ ★ نہایت معیاری کتابت ★ آفسٹ کی نظر افروز طباعت اور

★ چہار رنگ شاہکار سرورق کے ساتھ

★ ہدیہ ۸/۵۰ روپے

مکتبہ آئین، ریلوے روڈ، لاہور

ایوانِ ادب۔ اردو بازار۔ لاہور

فون نمبر ۶۷۱۶۶

محمد سلیمان اظہر ایم اے

سیدہ امّ کلثوم رضی اللہ عنہا بنت محمد ﷺ

صاحبزادیوں میں سے سب سے بڑی صاحب زادی ہونے کا شرف کس کو حاصل ہے اور ان میں سے سب سے کم سن کون ہیں؟ اس میں سخت اختلاف ہے۔ چنانچہ علامہ حلی نے چند قول نقل کئے ہیں جو ترتیب وار درج ذیل ہیں:

۱۔ زینب، رقیہ، فاطمہ، اُمّ کلثوم۔

۲۔ رقیہ، فاطمہ، اُمّ کلثوم۔

۳۔ رقیہ، زینب، ام کلثوم، فاطمہ۔

۴۔ زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ۔

۵۔ فاطمہ، رقیہ — رضی اللہ تعالیٰ عنہن (سیرت حلی ص ۳۴۵/۳)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک صحیح نمبر چار ہے، جنھوں نے "ام کلثوم کو حضرت فاطمہ سے بھی کم سن کہا ہے، اس کو انھوں نے "قیل" (صیغہ تمریض) سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فتح الباری ص ۴۲۲/۱۵)

یہی اسلوب امام ابن قیم نے اختیار کیا ہے (زاد المعاد ص ۳۵/۱)

اس اختلاف کے حل کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس سلسلے کی روایات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ ان کی روایاتی حیثیت کے تعین سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ: حضرت ام کلثوم، حضرت فاطمہ سے کم سن ہیں یا بڑی؟ ہمارے نزدیک صحیح بات وہی ہے جو جمہور نے کہی ہے۔ باقی رہا یہ استبعاد کہ: اگر بڑی تھیں تو حضرت فاطمہ سے پہلے ان کا نکاح کیوں نہ ہوا؟ تو صرف اتنی سی بات سے "عمر یا سن و سال کا تعین کچھ علمی سی بات نہیں ہے۔ طبقات کی روایت اگر واقدی سے ہے تو جھگڑا ختم، کیونکہ وہ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔

بہرحال یہ علمی اور تاریخی مضمون ہے، اگر کوئی صاحب اس کے سلسلے میں اپنا جائزہ

پیش کرنا چاہے تو محدث کے اوراق اس کے لیے حاضر ہیں بشرطیکہ نقد و نظر کا انداز محققانہ متانہ اور محققانہ ہو۔

(ادارہ)

حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بارگاہِ الٰہی سے چار صاحبزادیاں عطا ہوئیں۔ جن کے اسمائے گرامی سیدہ زینب، سیدہ رقیہ، سیدہ فاطمہ اور سیدہ ام کلثوم ہیں۔ عام تصور کے مطابق سیدہ فاطمہ رسول اللہ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہیں اور ان کی ولادت دوسروں کے برعکس بعد بعثت ہوئی۔ سیدہ زینب کی شادی ابو العاص بن ربیع اموی سے ہوئی۔ سیدہ رقیہ کی شادی آنحضرت کے چچا زاد بھائی اور ابو لہب کے بیٹے عتبہ سے ہوئی۔ سیدہ ام کلثوم کی شادی عتبہ کے بھائی عتیبہ سے ہوئی۔ بعثت نبوی کے بعد ان بدبختوں نے کائنات کی شہزادیوں کو طلاق دے دی جس پر آنحضرت نے سیدہ رقیہ کی شادی حضرت عثمان بن عفان اموی سے کردی۔ اور جب سیدہ رقیہ سیدنا عثمان کی زوجیت میں فوت ہو گئیں تو رسول اللہ نے سیدہ ام کلثوم کا نکاح بھی انہی کے ساتھ کر دیا۔ حضرت فاطمہ کی شادی حضرت علی سے ہجرت مدینہ سے فوراً بعد ہوئی اور بنا جنگ بدر کے بعد حارثہ بن نعمان کے مکان میں عمل میں آئی۔

اس عمومی تصور کو من وعن تسلیم کر لینے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جناب رسالتمآب نے سیدہ رقیہ کا نکاح ثانی تو طلاق کے فوراً بعد کر دیا۔ لیکن سیدہ ام کلثوم کے نکاح ثانی میں ۱۳ سال کی تاخیر کیوں کی جب کہ اس دوران آپ نے ام کلثوم سے چھوٹی صاحبزادی سیدہ فاطمہ کی شادی حضرت علی سے کر دی۔ بڑی اور مطلقہ صاحبزادی کو نظر انداز کر کے چھوٹی کا نکاح کیوں کیا۔ اور کیوں اسے عین حالت جوانی میں اتنا طویل عرصہ اپنے گھر بٹھائے رکھا جب کہ عرب معاشرے میں مطلقہ یا بیوہ سے شادی کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی ہے اور ہر آن اچھے سے اچھا خاوند مل سکتا تھا۔

ہمارا یہ مختصر سا مقالہ اسی سوال کا جواب ہے۔ ہم اپنے نظریات کے حتمی اور قطعی ہونے پر مصر نہیں ہیں بلکہ اہل علم قارئین کی جانب سے تنقید و تبصرہ کے خواہاں ہیں۔

ہم سب سے پہلے وہ روایات آپ کے سامنے رکھتے ہیں جن کے باعث وہ تصور ابھرتا ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔

محمد بن حبیب کی کتاب المحبر میں آنحضرتؐ کی اولاد امجاد کا بایں الفاظ ذکر ہے۔

فولدت (خدیجة) للنبی القاسم وزینب وام کلثوم و فاطمه وعبد الله وهو الطاهر والطیب اسم واحد" (ص۹) کہ خدیجہ سے رسول اللہ کے ہاں قاسم، زینب، ام کلثوم فاطمہ اور عبداللہ پیدا ہوئے" اس روایت میں حضرت فاطمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب صاحبزادیوں میں سے چھوٹی ظاہر کیا گیا ہے۔

شیعہ حضرات کی مستند ترین کتاب اصول کافی ہیں۔ رسول اللہ کی از بطن خدیجہ اولاد کا تذکرہ یوں ہے۔

وتزوج خدیجة وهو ابن بضع وعشرین سنة فولدت له منها قبل بعثه القاسم ورقیه وزینب وام کلثوم وولد له بعد المبعث الطیب والطاهر والفاطمه علیها السلام (ص ۲۷۸)

کہ رسول اللہ نے حضرت خدیجہ سے ۲۵ سال کی عمر کے لگ بھگ شادی کی اور ان کے بطن سے رسول اللہ کے ہاں قاسم، رقیہ، زینب، ام کلثوم قبل بعثت اور طیب، طاہر، فاطمہ بعد بعثت پیدا ہوئے" اس روایت میں جو شیعی اصح الکتب سے نقل کی گئی ہے۔ جہاں آنحضرت کی چار صاحبزادیوں کا ثبوت ملتا ہے وہیں فاطمہ کو چاروں میں چھوٹی بھی ظاہر کیا گیا ہے اور ان کی ولادت کا زمانہ بعد بعثت نبوی بتایا گیا ہے۔

یہی بات ذرا وضاحت کے ساتھ محمد بن علی ابن شہر آشوب کی کتاب آل ابی طالب میں مذکور ہے:

ولدت فاطمة بمکة بعد النبوة بخمس سنین ..... واقامت مع ابیها بمکة ثمانی سنین هاجرت معه الی المدینة فزوجها من علی بعد مقدمها المدینة بسنتین" کہ حضرت فاطمہ بعثت کے پانچ برس بعد مکہ میں پیدا ہوئیں۔ آٹھ سال اپنے والد گرامی کے گھر مکہ میں مقیم رہیں۔ پھر انھیں کے ساتھ مدینہ کی جانب ہجرت کی اور ہجرت کے دو سال بعد حضرت علی سے ان کی شادی (دس سال کی عمر میں) ہوئی" اس روایت میں بھی سیدہ کی ولادت بعد بعثت بتائی گئی ہے۔ دوسری باتوں سے قطع نظر اس میں یہ بات تو سراسر غلط ہے کہ سیدہ فاطمہ نے آنحضرت کے ساتھ مدینہ کی جانب ہجرت کی۔ کیونکہ یہ شرف اس کائنات میں سوائے سیدنا صدیق اکبر کے کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے۔

علامہ طبرسی کی کتاب اعلام الوریٰ باعلام الہدیٰ میں حضرت علی اور سیدہ فاطمہ کی شادی

کے وقت سیدہ کی عمر نو برس لکھی گئی ہے جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سیدہ کی ولادت، ۵ یا ۶ سن نبوت ہوئی۔ علامہ طبری فرماتے ہیں — وکان الفاطمة یوم بنی بھا امیر المومنین تسع سنین (ص ۸۱) کہ جس روز سیدہ اور امیر المومنین شادی کے بعد یکجا ہوئے سیدہ نو برس کی تھیں۔

اور دیگر بنات رسول کے متعلق طبقات ابن سعد سے چند روایات نقل کرتے ہیں۔ سیدہ زینب کے متعلق لکھا ہے: کانت اکبر بنات رسول اللہ تزوج ابن خالتھا ابو العاص بن ربیع قبل النبوت، وکانت اول بنات رسول اللہ تزوج ولدت لابی العاص علیاً و امامة" (طبقات جلد ۸ ص ۳۰) کہ سیدہ زینب رسول اللہ کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں اور سب سے پہلے آپ ہی کی شادی ہوئی۔ خاوند کا نام ابو العاص بن ربیع ہے اور امامہ اور علی نامی بچے پیدا ہوئے۔

سیدہ رقیہ کے متعلق لکھا ہے:۔ کان تزوجھا عتبة بن ابی لھب بن عبد المطلب قبل النبوة فلما بعث رسول اللہ وانزل اللہ تبت ید ابی لھب قال لہ ابوہ راسی من راسك حرام ان لم تطلق ابنتہ، ففارقھا رسول اللہ ولم یکن یدخل بھا واسلمت حین اسلمت امھا خدیجة بنت خویلد ..... وتزوجت عثمان بن عفان وھاجرت معہ الی ارض الحبشة ..... فتوفیت ورسول اللہ ببدر (طبقات جلد ۸ ص ۳۶) کہ سیدہ رقیہ کی شادی قبل نبوت عتبہ بن ابی لہب سے ہوئی جب سورۃ تبت نازل ہوئی تو ابو لہب نے بیٹے کو طلاق پر مجبور کیا۔ آنحضرتؐ نے خاوند بیوی میں مفارقت کروادی۔ پھر آپ کی شادی حضرت عثمانؓ سے ہوئی۔ ان کے ساتھ حبشہ گئیں اور مدینہ میں بدر کے موقع پر فوت ہوئیں۔

اور سیدہ ام کلثوم کا ذکر یوں ہے:۔ تزوجھا عتیبة بن ابی لھب بن عبد المطلب قبل النبوة ..... ففارقھا ولم یکن یدخل بھا فلم تزل بمکة مع رسول اللہ واسلمت حین اسلمت امھا ..... فلما توفیت رقیة بنت رسول اللہ خلف عثمان بن عفان علی ام کلثوم بنت رسول اللہ وکانت بکرا وذلك فی شھر ربیع الاول سنة ثلاث من الھجرة وماتت فی شعبان سنة تسع من الھجرة (طبقات جلد ۸ ص ۳۷-۳۸) کہ سیدہ ام کلثوم کی شادی عتیبہ بن ابی لہب سے ہوئی۔ پھر

قبل دخول طلاق ہوگئی۔ ہجرت تک آپ رسول اللہ کے ساتھ مقیم رہیں، ہجرت کے بعد ربیع الاول ۳ھ میں آپ کی شادی عثمان بن عفان سے کردی گئی (بعد وفات رقیہ) آپ کا وصال شعبان ۹ھ میں ہوا۔

ہمارے لیے آنحضرتؐ کے تمام صاحبزادے اور صاحبزادیاں یکساں قابلِ احترام ہیں۔ان کے پاؤں کی خاک ہمارے لیے سُرمۂ چشم ہے۔ رسول اللہ بھی اپنی تمام اولاد سے یکساں محبت کرتے تھے۔ اس معاملے میں باہم تفریق کرنا یا کسی ایک کو دوسروں سے بڑھانا آنحضرت کی شفقتِ پدری پر حرف گیری کرنا ہے۔ ایک مخصوص اندازِ فکر کے حامل نے امت کے سامنے کچھ اس طرح کی صورت حال پیش کر رکھی ہے کہ آنحضرتؐ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ حضرت فاطمہ کو چاہتے تھے اور صاحبزادیوں کی اولاد میں حضرات حسنینؓ کو۔ لیکن یہ لوگ اس غم و حزن سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں جو آنحضرتؐ کو اپنے صاحبزادے ابراہیم کی وفات پر ہوا تھا۔حضرت زینب کی صاحبزادی حضرت امامہ سے رسول اللہ کی محبت فراموش کردی جاتی ہے جسے آپؐ دورانِ نماز کندھوں پر اٹھائے رکھتے تھے۔ انھیں یہ بات یاد نہیں ہے کہ رسول اللہ رحمۃ للعالمین ہونے اور لاتثریب علیکم الیوم کا اعلانِ عام کرنے کے باوجود اس بدبخت انسان کو واجب القتل قرار دے دیا تھا جس نے سیدہ زینب کے سفرِ مدینہ کے دوران انھیں اذیت دی تھی۔ ان مخصوص نظریات کے حامل افراد کو آنحضرتؐ کی زندگی کا وہ واقعہ بھی یاد نہیں رہتا جب رسول اللہ نے اپنے گھر میں کوئی مرغوب شے پکوا کر ایک پلیٹ حضرت اسامہ بن زید کے ہاتھ اپنی صاحبزادی سیدہ رقیہ کے گھر بھجوائی۔ اسامہ جب واپس آئے تو آپؐ نے اشتیاق سے پوچھا کہ گھر والے (حضرت عثمان اور سیدہ رقیہ) کیا کر رہے تھے۔ جواب ملنے پر پوچھا۔ اسامہ کیا تو نے اس جوڑے سے زیادہ خوبصورت جوڑا کبھی دیکھا ہے۔ ہمارا مقصد کسی کو بڑھانا یا گھٹانا نہیں ہے بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ رسول اللہ کی ساری اولاد ان کے پارہ ہائے جگر تھے۔ اور آپ ان سب پر انتہائی شفیق و مہربان تھے۔ حضرت فاطمہ کے متعلق جو عام روایات اس قسم کی ملتی ہیں کہ فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے یا میں اس سے محبت کرتا ہوں اور ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ فاطمہ آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ ان اقوال کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ کی تمام اولاد یکے بعد دیگرے آپؐ کی حیات مبارکہ میں ہی فوت ہوگئی تھی۔ حضرت فاطمہ ہی صرف ایک صاحبزادی ہیں جو بعد وصال نبوی فوت ہوئیں۔ جوں جوں آپ کی اولاد اس دنیا سے اٹھتی جاتی تھی رسول اللہ کی محبت پدری باقی رہ جانے والی اولاد

کی طرف زیادہ مرتکز ہوتی جاتی تھی۔ جب ایک ہی صاحب زادی رہ گئی تو پھر آپؐ کے جذبات وہی ہونے چاہئیں جس قسم کے اقوال ملتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی صورت حال سے دوسری اولاد کی عظمت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ایک ضمنی گفتگو چل نکلی تھی بات دراصل سیدہ ام کلثوم بنت محمدؐ کی ولادت، عمر اور شادی کے بارے میں ہو رہا ہے ۔۔۔ مشہور شیعہ کتاب اعلام الوریٰ باعلام الہدیٰ میں آنحضرت کی صاحبزادیوں کے نکاحوں کا ذکر بایں الفاظ ملتا ہے: ۔۔۔ فاما زینب بنت رسول اللہ فتزوجها ابو العاص بن ربیع فولدت لابی العاص جاریة اسمها امامة فتزوجها علی ابن ابی طالب بعد وفات فاطمة وماتت زینب بالمدینة بسبع سنین من الهجرة واما رقیة بنت رسول اللہ فتزوجها عتبة بن ابی لهب فطلقها قبل ان یدخل بها ولحقها منه اذیً فقال النبی اللهم سلط علی عتبة کلب من کلابك فتناوله الاسد من بین اصحابه وتزوجها بعده بالمدینة عثمان بن عفان فولدت له عبد اللہ ومات صغیرا نقره دیك علی عینیه فمرض وماتت بالمدینة زمن بدر۔ وتخلف عثمان علی دفنها ومنعه ذلك ان یشهد بدراً وقد كان هاجر عثمان الی الحبشة ومعه رقیة۔ واما ام کلثوم فتزوجها ایضاً بعد اختها رقیة تو فیت عنده واما فاطمة فتفرد بها بابا (ص ۱۴۶) ۔۔۔ یعنی زینب بنت رسول اللہؐ کی شادی ابو العاص بن ربیع اموی سے ہوئی اور امامہ نامی صاحبزادی پیدا ہوئی۔ حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد امامہ سے حضرت علی نے شادی کر لی۔ رقیہ بنت رسول اللہؐ کی شادی عتبہ بن ابی لہب سے ہوئی جس نے قبل دخول طلاق دے دی۔ آنحضرت نے اس کے لیے بددعا فرمائی اور اسے شیر نے اچک لیا۔ پھر مدینہ میں جا کر رقیہ کی شادی حضرت عثمان سے ہوئی اور عبد اللہ پیدا ہوئے جو بچپن میں فوت ہو گئے۔ جنگ بدر کے موقعہ پر سیدہ رقیہ کا وصال ہوا حضرت عثمان ان کی تیمارداری کے باعث غزوہ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ اس سے قبل ہجرت حبشہ میں بھی سیدہ رقیہ جناب عثمان کے ساتھ تھیں۔ سیدہ رقیہ کی وفات کے بعد ام کلثوم کی شادی حضرت عثمان سے کر دی گئی اور آپ بھی انہی کے گھر فوت ہوئیں۔ حضرت فاطمہ کا ذکر ایک الگ باب میں کیا جائے گا۔

اس روایت میں حضرت رقیہ کی شادی عتبہ بن ابی لہب سے بیان کی گئی ہے۔ جس نے

قبل دخول طلاق دے دی تھی۔ آپ کی دوسری شادی ہجرت مدینہ کے بعد حضرت عثمان سے بیان کی گئی ہے۔ طلاق اور نکاح ثانی کے درمیان ایک طویل وقفہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی بتایا گیا ہے کہ ہجرت حبشہ کے دوران بھی سیدنا عثمان اور سیدہ رقیہ یکجا تھے۔ جبکہ ہجرت مدینہ سے برسوں قبل ہوئی تھی۔ علامہ طبرسی یا تو بھول گئے ہیں کہ ایک ہی روایت میں شادی قبل ہجرت حبشہ بھی بتاتے ہیں اور بعد ہجرت مدینہ بھی۔ یا دانستہ طور پر سیدہ رقیہ اور سیدنا عثمان کی ازدواجی زندگی کا عرصہ کم سے کم کر کے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس روایت میں دوسری اہم بات یہ بیان ہوئی ہے کہ جناب سیدہ ام کلثوم کا ایک ہی نکاح ہوا جو حضرت عثمان سے بعد وفات رقیہ تھا۔ یہاں عتیبہ سے شادی کا ذکر نہیں ہے تو گویا اس شیعہ مؤلف کے نزدیک آپ کی ایک ہی شادی ہوئی تھی اور یہ شادی جنگ بدر کے وقوع پذیر ہوئی جب کہ دیگر تمام صاحبزادیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ ام کلثوم عمر میں اپنی بہنوں سے چھوٹی تھیں جبھی ان کی شادی سب سے آخر میں ہوئی۔

اب اور روایت ملاحظہ فرمائیے جو اسی مضمون پر ملا باقر مجلسی نے حیاۃ القلوب حصہ دوم ص۸۸ پر نقل کی ہے۔

"حضرت جعفر روایت کردہ است کہ برائے رسول خدا از خدیجہ متولد شدند۔ طاہر، قاسم و فاطمہ و کلثوم و رقیہ و زینب۔ و فاطمہ را بحضرت امیرالمومنین تزویج نمود، و تزویج کرد با ابوالعاص بن ربیعہ کہ از بنی امیہ بود زینب را۔ و بعثمان بن عفان ام کلثوم را و پیش از آنکہ بخانہ آں رفت برحمت الٰہی واصل شد و بعد از و حضرت رقیہ را باو تزویج نمود۔" یعنی امام جعفر روایت کرتے ہیں کہ حضرت خدیجہ سے رسول اللہ کے ہاں طاہر، قاسم، کلثوم، رقیہ، فاطمہ اور زینب پیدا ہوئے فاطمہ کی شادی حضرت علی سے ہوئی۔ زینب کی شادی ابوالعاص بن ربیع اموی سے ہوئی۔ ام کلثوم کی شادی حضرت عثمان سے ہوئی لیکن رخصتی سے قبل وہ فوت ہو گئیں۔ اس پر سیدہ رقیہ کی شادی ان سے کر دی گئی۔

گویا علامہ طبرسی کے نزدیک سیدہ رقیہ کی شادی پہلے ہوئی اور ان کی وفات کے بعد ام کلثوم کا بیاہ حضرت عثمان سے ہوا۔ جب کہ ملا باقر کے مطابق معاملہ اس سے الٹ ہے یہ تمام گڑبڑ اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ شیعہ حضرات جناب سیدہ فاطمہ کی ولادت عہد اسلام میں ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کی خاطر انہیں باقی تمام بہنوں سے چھوٹی ظاہر کرتے ہیں

لیکن شادیوں کے معاملہ میں یہ دعویٰ ختم ہو کے رہ جاتا ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے شیعہ کے نزدیک بڑی یعنی ام کلثوم کی موجودگی میں چھوٹی یعنی سیدہ فاطمہ کی شادی کردی ہے اور بڑی بہن کی شادی چھوٹی کے ایک سال بعد وقوع پذیر ہوئی۔ لیکن اگر اہل بیت کے ایک اہم رکن - ایک سربرآوردہ ہاشمی، عباسیوں کے سربراہ، رسول اللہؐ کے چچا زاد بھائی، حبر الامت اور ترجمان القرآن جناب عبداللہ بن عباس کا یہ بیان پیش نظر رکھا جائے تو معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

قال کان اول من ولد لرسول اللہ بمکۃ قبل النبوۃ القاسم وبہ کان یکنی ثم ولد لہ، زینب ثم رقیہ ثم فاطمہ ثم ام کلثوم ثم ولد لہ فی الاسلام عبد اللہ فسمی الطیب والطاہر امہم جمیعًا خدیجۃ بنت خویلد۔ (طبقات جلد ۱ ص ۱۳۳) یعنی ابن عباس کے مطابق قبل بعثت رسول اللہؐ کے ہاں خدیجہ سے قاسم پھر زینب، پھر رقیہ پھر فاطمہ پھر ام کلثوم اور بعد بعثت عبداللہ پیدا ہوئے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ ام کلثوم سب سے چھوٹی صاحبزادی ہیں اور فاطمہ ان سے بڑی ہیں اور سب صاحبزادیاں قبل بعثت پیدا ہوئی ہیں۔ طبقات جلد ۸ صفحہ ۱۹ کی یہ روایت بھی مذکورہ بالا مضمون کی تائید کرتی ہے۔

فاطمۃ بنت رسول اللہ وامہا خدیجۃ بنت خویلد بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی ولدتہا وقریش تبنی البیت وذلک قبل النبوۃ بخمس سنین یعنی سیدہ فاطمہ جناب خدیجہ کے بطن سے اس وقت پیدا ہوئیں جب قریش آنحضرتؐ کی بعثت سے ۵ برس قبل تعمیر کعبہ میں مصروف تھے۔

اس بات پر تمام شیعہ سنی مؤرخین متفق ہیں کہ علیؓ و فاطمہؓ کی شادی جنگ بدر سے قبل ہو گئی تھی اور باہم یکجائی جنگ بدر کے فوراً بعد عمل میں آئی۔ سیدہ رقیہ کا انتقال بدر کے روز ہوا اور حضرت عثمانؓ سے سیدہ ام کلثوم کی شادی بدر کے بعد ۳ھ میں ہوئی۔ شادیوں کی اس ترتیب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ ام کلثوم باقی بہنوں سے چھوٹی تھیں۔ تاہم اگر انھیں اس سے قبل عتیبہ بن ابی لہب کی بیوی تسلیم کیا جائے تو پھر انھیں سیدہ رقیہ کے ساتھ ہی طلاق ہو گئی تھی اور رسول اللہؐ نے رقیہ کی شادی تو فوراً حضرت عثمانؓ سے کردی لیکن ام کلثوم کی دوسری شادی میں ۱۳ سال کا عرصہ دراز حائل ہے۔ اس عرصہ میں رسول اللہؐ نے حضرت فاطمہ کی شادی کردی لیکن ام کلثوم کا نکاح موخر کردیا۔ یہ ساری الجھن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ام کلثومؓ

کہ بڑی اور سیدہ فاطمہ کو چھوٹی تسلیم کیا جائے لیکن اگر معاملہ الٹ تسلیم کر لیا جائے تو کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔ صرف عتیبہ سے شادی کا معاملہ تشریح طلب رہ جاتا ہے۔ اس نکاح سے بعض شیعہ روایات تو ویسے ہی انکاری ہیں اور جن شیعہ سنی روایات میں اس کا ذکر ملتا ہے وہاں طلاق قبل دخول کا بھی ذکر ہے۔ گویا اس وقت تک سیدہ ام کلثوم اس قدر کم سن تھیں کہ ان کی رخصتی عمل میں نہ آئی تھی۔ یہ اسی قسم کی صورتِ حال ہے جس قسم کی ہمارے ہندی معاشرے میں بھی موجود ہے کہ بچپن میں منگنی یا شادی کر دی جاتی ہے اور پھر کئی سال بعد بلوغت کے موقع پر رخصتی عمل میں آتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ نے اپنی یہ صاحبزادی بچپن میں ہی اپنے چچازاد بھائی عتیبہ سے منسوب کر دی ہو۔ بعثت کے بعد یہ نسبت برقرار نہ رہ سکی۔ اور چونکہ ابھی تک سیدہ کم عمر تھیں اسی لیے رسول اللہ نے خاموشی اختیار کی اور جب آپ سنِ بلوغ کو پہنچیں اس وقت ان کی بڑی بہن فوت ہو چکی تھیں۔ رسول اللہ اپنے اس داماد سے راضی تھے اسی لیے آپ کی شادی بھی انہیں کے ساتھ کر دی گئی۔ جو تمام بہنوں سے بعد میں وقوع پذیر ہوئی۔ اور یہ اس بات کی عمدہ ترین دلیل ہے کہ آپ سب سے چھوٹی تھیں۔

سعودی عرب کا تبلیغی مشن

سعودی عرب کے بیرونِ ملک تبلیغ و دعوتِ اسلام کے سب سے بڑے ادارے ادارات البحوث العلمیہ والافتاء والدعوۃ والارشاد کی طرف سے ایک تبلیغی مشن مصر، مراکش اور برطانیہ کے دورے پر جلد روانہ ہونے والا ہے۔ وفد کے قائد محدث عصر علامہ الشیخ محمد بن ناصر الدین البانی ہوں گے۔

ان کے علاوہ وفد میں فضیلت الشیخ محمد عبد الوہاب البنا (سعودی وزارت تعلیم) محمود احمد میرپوری (پاکستان) اور شریف احمد (ہندوستان) شامل ہوں گے۔

وفد مصر اور مراکش میں متعدد علمی اور دینی اجتماعات میں شرکت کرے گا۔ اور اس کے بعد برطانیہ کا مفصل تبلیغی دورہ کرے گا اور رمضان المبارک کے بعد واپس روانہ ہو جائے گا۔

نوجوان علماء میں قدیم وجدید علوم کی جامعیت اور ماہرانہ تربیت کیلئے

(درجہ تکمیل وتخصص)

الجامعۃ السلفیہ

جماعت اہلحدیث کے لیے صاحب تحقیق مصنف، تربیت یافتہ مدرس اور بہترین خطیب مہیا کرنے کے لیے علم وادب کے مرکز **لاہور** میں اعلیٰ تعلیم وتربیت کا مرکزی منصوبہ۔

* بلند پایہ محقق علماء اور پروفیسر حضرات کی تدریس۔
* عمدہ اور وسیع لائبریری سے استفادہ۔
* اہم موضوعات پر تقریری وتحریری مقالات اور مذاکرات علمیہ

کے تجرباتی طریقوں سے

- قرآن وسنت کی گہری بصیرت اور جدید علوم کا مطالعہ
- مشہور مذاہب، مکاتب فکر اور تحریکوں کا تقابلی جائزہ
- مختلف محکمہ جات، سماجی، قومی اور بین الاقوامی اداروں کی واقفیت اور معلومات عامہ
- عربی زبان کی تقریری وتحریری مشق کا خاطر خواہ انتظام۔

پہلا سال: علمی تکمیل وجامعیت کے لیے — اور — دوسرا سال: تحقیق وتصنیف، درس وتدریس اور دعوت وخطابت کے شعبہ جات میں سے کسی ایک میں تخصص کے لیے۔

دوسالہ نصاب کی تکمیل کی شرط پر رہائش وتعلیم کے مفت انتظام کے علاوہ دوران تربیت کفالت کیلئے ۲۵۰/ روپے ماہوار وظیفہ۔

حافظ محمد یحییٰ عزیز

ناظم تعلیمات مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان

حدیث منزل ۷- ایبک روڈ (انار کلی) لاہور

MUHADDIS
Regd. No. L. 7895